دراسات

نثار احمد فاروقی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
اشتراک
قومی اردو کونسل، نئی دہلی

دِراسات

چند تحقیقی اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ

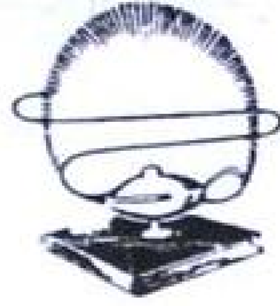
نثار احمد فاروقی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

اشتراک

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

Derasaat
by
Nisar Ahmad Farooqi
Rs.99/-



صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295
Email: monthlykitabnuma@gmail.com

شاخیں

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی۔110006 ☎ 011-23260668
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی۔400003 ☎ 022-23774857
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔202002 ☎ 0571-2706142
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، بھوپال گراؤنڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025 ☎ 011-26987295

قومی اردو کونسل کی کتابیں مذکورہ شاخوں پر دستیاب ہیں

سنہ اشاعت: 2012 تعداد: 1100 قیمت: -/99روپے
ISBN :978-81-7587-833-4 سلسلۂ مطبوعات: 1647

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025
فون نمبر: 49539000 فیکس: 49539099
ای میل: urducouncil@gmail.com ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: بھارت گرافکس۔C-83 اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیس I، نئی دہلی۔110020
اس کتاب کی چھپائی میں 70 GSM TNPL Maplitho کاغذ کا استعمال کیا گیا ہے۔

چند معروضات

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ایک قدیم اشاعتی ادارہ ہے، جس نے معتبر ادیبوں کی سینکڑوں کتابیں شائع کی ہیں اور اپنے ماضی کی شان دار روایات کے ساتھ آج بھی سرگرمِ عمل ہے۔ مکتبہ کے اشاعتی کاموں کا سلسلہ ۱۹۲۲ء میں اس کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا جو زمانے کے سرد و گرم سے گزرتا ہوا اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔ درمیان میں کئی دشواریاں حائل ہوئیں۔ نامساعد حالات نے سمت و رفتار میں خلل ڈالنے کی کوشش بھی کی مگر نہ اس کے پائے استقلال میں لغزش ہوئی اور نہ عزم سفر ماند پڑا، چنانچہ اشاعتوں کا تسلسل کلی طور پر کبھی منقطع نہیں ہوا۔

مکتبہ نے خلاق ذہنوں کی اہم تصنیفات کے علاوہ طلبا کی نصابی ضرورت کے مطابق درسی کتب بھی شائع کیں اور بچوں کے لیے کم قیمت میں دستیاب ہونے والی دل چسپ اور مفید کتابیں بھی تیار کیں۔ ''معیاری سیریز'' کے عنوان سے مختصر مگر جامع کتابوں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا اور اسے عملی جامہ پہنایا اور یہی عمل اس کا نصب العین قرار پایا۔ مکتبہ کا یہ منصوبہ بہت کامیاب رہا اور مقبول خاص و عام ہوا۔ آج بھی اہل علم و دانش اور طلبا مکتبہ کی مطبوعات سے تعلق خاطر رکھتے ہیں۔ درس گاہوں اور جامعات میں مکتبہ کی مطبوعات کو بہ نظرِ استحسان دیکھا اور یاد کیا جاتا ہے۔

ادھر چند برسوں سے اشاعتی پروگرام میں کچھ تعطل پیدا ہو گیا تھا جس کے سبب فہرست کتب کی اشاعت بھی ملتوی ہوتی رہی مگر اب برف پگھلی ہے اور مکتبہ کی جو کتابیں کم یاب بلکہ نایاب ہوتی جا رہی تھیں ان میں سے دو سو ٹائٹل قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے شائع ہو چکے ہیں اور ان سے زیادہ قطار میں ہیں (اسی دوران بچوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو کتابیں مکتبہ نے بلاشرکتِ غیرے شائع کی ہیں)۔ زیرِ نظر کتاب مکتبہ جامعہ اور قومی کونسل کے مشترکہ اشاعتی سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔

مکتبہ کے اشاعتی پروگرام نے جمود کو توڑنے اور اس کی ناؤ کو بھنور سے نکالنے میں مکتبہ جامعہ کے بورڈ آف ڈائرکٹرس کے چیرمین محترم جناب نجیب جنگ صاحب (آئی اے ایس) وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے جس خصوصی دل چسپی کا مظاہرہ کیا ہے وہ یقیناً لائق ستائش اور ناقابلِ فراموش ہے۔ مکتبہ جامعہ ان کا ممنون احسان رہے گا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اربابِ حل وعقد کا شکریہ بھی ہم پر لازم ہے جن کے پُرخلوص تعاون کے بغیر یہ اشتراک ممکن نہ تھا۔ اوّلین مطبوعات میں کونسل کے سابق ڈائرکٹر کے تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا جاچکا ہے۔ مکتبہ کی باقی کتابیں کونسل کے موجودہ فعال ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین صاحب کی خصوصی توجہ اور سرگرم عملی تعاون سے شائع ہو رہی ہیں، جس کے لیے ہم ان کے اور کونسل کے وائس چیرمین پروفیسر وسیم بریلوی صاحب کے ممنون ہیں اور تہ دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ مکتبہ کو ہمیشہ ان مخلصین کی سرپرستی حاصل رہے گی۔

خالد محمود
مینجنگ ڈائرکٹر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

فہرست

انتساب

والدۂ مرحومہ کی یادِ عزیز

کے نام

قصۂ مہر افروز و دلبر

"قصۂ مہر افروز و دلبر" اردو نثر کی ایک قدیم داستان ہے جسے ڈاکٹر مسعود حسین خاں (وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی) نے ۱۹۶۶ء میں شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کی طرف سے شائع کیا تھا۔ اس وقت مسعود صاحب جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو تھے۔

یہ کتاب ٹائپ میں پورے اہتمام سے چھپی ہے۔ قصے کا متن ۲۱۶ صفحات میں آیا ہے، اس کے ساتھ متن کے حل طلب الفاظ کی تشریح بطور ضمیمہ شامل ہے۔ اردو کی کتاب اور اغلاط طباعت سے عاری ہو، یہ بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے اس لیے آخر میں "صحت نامہ" بھی موجود ہے اور ایسے اہم متن میں یہ ضروری بھی تھا۔ ابتدا میں ۸۰ صفحوں کا مقدمہ ہے جس میں کتاب، مصنف، زبان و اسلوب، قصے کی ادبی اہمیت اور اس کا صوتیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں اردو کے سچے عالم اور کھرے انسان ہیں۔ گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر علمی خدمت کرنا اور نشاط مطالعہ سے سرشار رہنا ان کا شعار ہے۔ مطوبی و مسخرگی ان کا پیشہ نہیں اس لیے جو کچھ لکھتے ہیں وہ اُن کے علمی ذوق اور تہذیب رسم عاشقی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اردو کے کلاسکی سرمائے کے علاوہ لسانیات میں ان کا عمیق مطالعہ ہے۔ ان کی تحریریں تامّل اور تفکّر سے لکھی جاتی ہیں، اور آب

درنگ سے خالی نہیں ہوتیں۔ اِس ۴۸ صفحوں کے مقدمے میں بھی یہ خصوصیات موجود ہیں۔

متن کے ساتھ ہی اصل مخطوطے کے دو صفحوں کا عکس بھی شامل ہے۔ پہلے صفحے پر کسی شخص نے رومن رسم الخط میں اردو کے کچھ فقرے لکھے ہیں جس کے قبضے میں یہ مخطوطہ رہا ہو گا:

"MALEQEEC QETAB QA NAYAB SAHAB

ZZO QOI DAYA QARE SO ZZHUTTA HARE"

(مالک اس کتاب کا نائب صاحب، جو کوئی دعویٰ کرے سو جھوٹا ہے)

اسی صفحے پر دو تین جگہ قصّے کا نام "قصّہ مہر افروز و دلبر" لکھا ہے اور اسی پر "فقرہ عیسوی خاں" بھی درج ہے۔ دوسرا عکس ورق ا۔ب کا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مخطوطہ گوالیار میں خانقاہِ حضرت جی کے کتب خانے میں رہ چکا ہے اور اِسے سید علی غمگین دہلوی کے سجّادہ نشین شاہ محمد غنی حضرت جی نے آغا حیدر حسن دہلوی کی نذر کیا تھا۔

آغا حیدر حسن دہلوی (پسِ پردہ والے) دلّی کے روڑے ہیں۔ بیگمات اور شرفا کی زبان اور دلّی کے لب و لہجے پر حیرت انگیز قدرت رکھتے ہیں۔ دلّی کی نصف صدی پہلے کی سماجی زندگی، ماحول، ٹھاٹ باٹ اور رنگ رلیوں کے بارے میں جتنا اور جیسا وہ بیان کر سکتے ہیں، شاید کسی دوسرے سے ممکن نہ ہو۔ ان کی گفتگو بڑی رسیلی، لچھے دار اور بانکے تیور لیے ہوتے ہوتی ہے۔ آسکر وائلڈ کے بارے میں سنا تھا کہ وہ جس محفل میں موجود ہوتا تھا، سب اسی کی طرف "ہمہ تن گوش" رہتے تھے، اور آغا حیدر حسن کو دیکھا ہے کہ جہاں وہ "گل افشانیِ گفتار" کے جوہر دکھا رہے ہوں وہاں اور کسی کا چراغ نہیں جل سکتا۔

آغا حیدر حسن نے یہ مخطوطہ پروفیسر مسعود حسین خاں کو دیا اور انھوں نے اسے محنت اور سلیقے سے مرتّب کر کے شائع کیا ہے۔ مخطوطے کی چند اہمیتیں یہ ہیں:

الف: یہ شمالی ہند میں اردو نثر کے قدیم نمونوں میں سے ایک ہے
ب: یہ دلّی اور اس کے اطراف کی بولی پیش کرتا ہے
ج: یہ ہماری داستانوں کے ذخیرے میں ایک قابل قدر اضافہ ہے
د: اس کی زبان کا صوتیاتی اور لسانیاتی مطالعہ ہمیں اردو کی بولی کے ارتقاء کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے
ہ: اس قصّے سے طبقۂ امراء کی معاشرت، طور طریق، لباس، گفتار، آداب والقاب اور عمومی ماحول کا اندازہ ہوتا ہے۔

نظر بریں کوئی ایسا شخص ہی اس کتاب کو ایڈٹ کرنے کا اہل ہوسکتا تھا جسے اردو زبان کی مختلف بولیوں اور ان کے عہد بعہد ارتقا کا حال معلوم ہو، ہند آریائی زبانوں کے ڈھانچے سے عالمانہ واقفیت رکھتا ہو، ساتھ ہی اردو کے کلاسکی سرمائے پر اس کی گہری نظر ہو۔ جو نہ صرف کتاب کا متن جدید اصول ترتیب سے مدوّن کرے بلکہ اس کے مواد کا ادبی و لسانیاتی جائزہ بھی لے سکے۔ دیکھا جائے تو ڈاکٹر مسعود حسین خاں اس کے لیے موزوں ترین شخصیت ہیں۔ اُنھوں نے متن کو بہترین انداز سے پیش کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔

لیکن کتاب کی ادبی، لسانی اور تاریخی اہمیت کی وجہ سے لامحالہ چند سوالات ذہن میں آتے ہیں اگر یہ طے ہوجائے کہ مصنّف کون ہے تو زمانہ خود بخود متعیّن ہوجائے گا۔

قصّے کا مصنّف:

اس کتاب کو عیسوی خاں کی تصنیف کہا گیا ہے۔ سرورق پہ بھی یہی نام چھپا ہے، مگر اصل مخطوطے کے متن میں کہیں عیسوی خاں کا نام نہیں آیا۔ پہلے صفحے پر (جس کا عکس شامل کتاب ہے) قصّۂ عیسوی خاں لکھا ہوا ہے، اس ایک موقع کے سوا اور کہیں یہ مذکور نہیں کہ تصنیف کرنے والا کون ہے؟ پہلے ورقا کے یہ الفاظ بھی کسی دوسرے کے قلم سے ہیں، یعنی متن کتاب کے

خط سے مختلف ہے۔ دوسرے اِن الفاظ سے لازماً یہ مطلب نہیں نکلتا کہ یہ قصّہ "تصنیفِ عیسوی خاں" ہے!

مقدمے میں مصنّف کی شخصیت سے بحث کرتے ہوئے، آغا حیدر حسن دہلوی کے حوالے[2] سے فاضل مرتّب نے لکھا ہے کہ عیسیٰ خاں موسیٰ خاں رؤسائے دہلی کا ایک قدیم خاندان تھا۔ آزاد نے شاہ نصیر کے ذکر میں اُن کا ایک لطیفہ درج کیا ہے۔ "عیسیٰ خاں اور موسیٰ خاں دو بھائی دلّی میں تھے۔ مال و دولت کی بابت دونوں میں جھگڑا ہوا، عیسیٰ خاں ناکام ہوئے۔ موسیٰ خاں نے کچھ عدالت کے زور سے کچھ حکمت عملی سے سارا مال مار لیا۔ شاہ صاحب (نصیر دہلوی) نے بطور ظرافت چند شعر کا قطعہ کہا،[3] ایک مصرع یاد ہے:

ہوئی آفاق میں شہرت کہ عیسیٰ خاں کا گھر موسا

لطف یہ کہ دونوں بھائی شاعر تھے۔ ایک کا تخلّص آفاق، دوسرے کا شہرت تھا۔"[4]

اس کے بعد مسعود صاحب نے لکھا ہے کہ: "عیسیٰ خاں، موسیٰ خاں کے بارے میں مزید تفصیلات مضامین فرحت (حصّہ ششم) میں حافظ عبدالرحمٰن خاں

---

(۱) میں نے اس تبصرے کا اولین مسودہ اشاعت سے قبل ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔ اُنھوں نے جابجا اپنے اختلافی نوٹ لکھے ہیں جنھیں یہاں قلابین ( ) میں درج کیا جائے گا۔ آخر میں مسعود صاحب کا وہ خط بھی درج کر رہا ہوں جو انھوں نے مضمون کا مسودہ واپس کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا۔

(۲) محض آغا صاحب کے حوالے سے نہیں، بلکہ فرحت اللہ بیگ کے حوالے سے بھی جو نسبتہً زیادہ مستند ہیں۔ (مسعود حسین خاں)

(۳) ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے کلّیات شاہ نصیر دہلوی ایڈٹ کیا ہے۔ میرے استفسار پر اُنھوں نے بتایا کہ یہ قطعہ کلّیات میں موجود نہیں ہے۔

(۴) آبِ حیات: ۴۱۲ (طبع دہم)

احسان کے حالات میں فرحت اللہ بیگ نے درج کی ہیں۔ احسان کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔لیکن اس خاندان کے تمام حالات کا سرچشمہ آغا حیدر حسن صاحب ہی کی معلومات ہے حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان جن کے پرنانا تھے“۔[1]

آگے چل کر بتایا ہے کہ” احسان کے آباؤ اجداد ”کسی زمانے“ میں بخارا کے حاکم تھے ”جب“ مغلوں نے ترکستان کو تاراج کرنا شروع کیا، اس وقت یہ خاندان ہٹ کر ہرات آگیا.... آخر دو بھائیوں نے گھر بار کو خیرباد کہہ کر ہندوستان کا رخ کیا۔ اُس زمانے میں خاندانِ مغلیہ دہلی میں حکمراں تھا، ان دونوں بھائیوں کی دہلی میں بڑی قدر و منزلت ہوئی۔ بڑے بھائی کو موسیٰ خاں اور چھوٹے بھائی کو عیسیٰ خاں خطاب ملا ...... خدا معلوم کس نیک ساعت میں خطاب ان دونوں بھائیوں کو ملے تھے کہ دہلی میں بیسیوں خاندانوں کی بادشاہت بدل گئی لیکن یہ خطاب اُسی طرح باپ سے بیٹوں پر اُترتے چلے آئے اور غدر کے بعد جب دہلی کی سلطنت ختم ہوگئی اُس وقت اِن کا بھی سلسلہ ٹوٹا“۔[2]

آغا حیدر حسن دہلوی ہی کی روایت ہے کہ” یہ خاندان ثروت و اقتدار کے ساتھ علم و فضل میں بھی ممتاز رہا ہے اگر ایک طرف یہ لوگ دربار میں امرا کے طبقے میں کھڑے ہوتے تھے تو دوسری طرف خلوت خاص میں علماء کے ساتھ بیٹھے نظر آتے تھے۔سلطنت مغلیہ کے زمانے میں شہزادوں اور شہزادیوں کو کلام مجید پڑھانے کی خدمت اسی خاندان میں تھی۔ اور غدر تک قائم رہی .... محمد شاہ اور احمد شاہ کے زمانے میں یہ خدمت احسان کے والد حافظ غلام رسول خاں کے سپرد تھی۔ان کا خطاب موسیٰ خاں محبّ الدولہ

---

(۱) قصہ مہر افروز و دلبر (مقدمہ) ۲ [یہ صحیح نہیں، فرحت اللہ بیگ کی معلومات خاندانی ہیں، جس کی تصدیق کر لی گئی ہے۔م ح خ]

(۲) قصہ مہر افروز و دلبر (مقدمہ): ۳

بہادر تھا۔"[1]

خود فاضل مرتب نے یہ تسلیم کیا ہے کہ مخطوطے پر "قصۂ عیسوی خاں بہادر" کسی دوسرے قلم سے لکھا ہوا ہے۔ پھر عیسٰی خاں اور عیسوی خاں میں بہت فرق ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ عیسٰی خاں، موسٰی خاں خطاب والے امراء ہوئے ہیں تو ان میں سے کون سے عیسٰی خاں ہیں جو اس قصے کے عیسوی خاں بن گئے ہیں؟ آغا حیدر حسن دہلوی ایک پربہار شخصیت ہیں مگر وہ تاریخ اور روایت میں فرق نہیں کرتے اور اُن کے بیان کو تاریخی سند کا درجہ دینا مشکل ہے۔

محمد حسین آزاد نے جن عیسٰی خاں، موسٰی خاں کا ذکر کیا ہے اور ان میں سے ایک کا تخلص آفاق اور دوسرے کا شہرت بتایا ہے، یہ بھی ایک لطیفے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ شاہ نصیر کے ہم عصر شعراء کا حال عموماً تذکروں میں مل جاتا ہے۔ اس نام اور تخلص کے شاعروں کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ البتہ امیر بخش شہرت اور فریدالدین آفاق [متوفی ۱۲۵۳ھ/ ۱۸۳۷ء] اسی عہد میں ہوئے ہیں۔ شہرت کے باپ کا نام عیسٰی خاں تھا، اور آفاق شہرت کے پھوپی زاد بھائی تھے۔ یہ تینوں دلّی سے حیدرآباد دکن چلے گئے تھے[2] وہاں نواب شمس الامراء بہادر اور مہاراجا چندو لال شاداں [متوفی ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء] کے درباروں

(۱) ایضاً: ۳۰۔ جب تک حافظ غلام رسول خاں کا سال ولادت و وفات معلوم نہ ہو یہ بیان تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ محمد شاہ کے آغاز اور بہادر شاہ کے انجام میں تقریباً (۱۴۰) برس حائل ہیں۔ عادةً یہ ممکن نہیں کہ باپ کو جو خدمت محمد شاہ کے زمانے میں ملی ہو، بیٹے کے حصے میں بہادر شاہ ثانی کے عہد میں آئی ہو۔ حافظ غلام رسول اس خدمت پر شاہ عالم ثانی کے دور میں رہے ہوں گے۔

(۲) گلزار آصفیہ: ۴۵۹

سے توسّل پیدا کیا تھا۔[1]

یہ بعض کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ دونوں شاہ فخر الدین محبّ النبی دہلوی [ف ۱۱۹۹ھ/ ۸۵-۱۷۸۴ء] کے مرید تھے۔ شاہ کمال نے تذکرہ مجمع الانتخاب میں ایک شاعر میر بخش شہرت کا ترجمہ لکھا ہے[2] اور اُنھیں باصطلاحِ احیاء یاد کیا ہے یعنی [۱۲۱۸ھ/ ۰۴-۱۸۰۳ء] میں زندہ تھے۔ میرا خیال ہے کہ کاتبِ نسخہ کی غلطی یا شاہ کمال کے سہو سے امیر بخش کی جگہ میر بخش لکھا گیا ہے۔ اس کو تقویت اس سے بھی ملتی ہے کہ میر بخش کے باپ کا نام عیسیٰ خاں ہی بتایا ہے۔

بدین وجوہ میرا خیال ہے کہ آزاد والے لطیفے کا تعلق عیسیٰ خاں اور موسیٰ خاں سے ہے تو آفاق اور شہرت اُس میں برائے بیت ہیں اور اگر اس تخلص کی رعایت ہے تو یہ قصّہ مذکورہ بالا دو بھائیوں کا ہو سکتا ہے۔

رہا اُس خاندان کا معاملہ جس میں تغلق کے وقت سے بہادر شاہ ظفر تک خطاب "اُترتا" رہا حالانکہ بیسیوں خاندانوں میں بادشاہت بدل گئی" تو عرض یہ ہے کہ اس میں دو غلطیاں ہیں جن پر مسعود صاحب کو غور کرنا چاہیے تھا ایک تاریخی دوسری منطقی۔ تاریخی تو یہ کہ تغلق کے بعد لودھی خاندان آیا ہے اور ان کے بعد مغلوں کا زمانہ ہے (درمیان میں بیس سال سوری خاندان کے ہیں) "بیسیوں خاندان" بہت بڑا مبالغہ ہے۔ سلطنت کے ابتدائی زمانے کی تو زیادہ تاریخیں نہیں ہیں لیکن عہد مغلیہ کا بہت کچھ حال کتابوں میں محفوظ ہے۔ ایسا خاندان جو تغلق سلاطین (آغاز: ۱۳۲۱ء) کے زمانے سے عہد بہادر شاہ ظفر (خاتمہ: ۱۸۵۷ء) تک منصب امارت پر فائز اور علم و فضل میں ممتاز رہا ہو، اس کے

---

(۱) تذکرہ مجمع الانتخاب (تلخیص نثار احمد فاروقی) مشمولہ تین تذکرے: ۹۱
نیز مخطوطہ سالار جنگ ورق ۵۲۹-الف۔

(۲) حوالہ ماسبق

کسی اہم فرد کا ذکر تاریخوں میں کیوں نہیں ہے؟ مغلوں کے آخری زمانے میں موسیٰ خاں کا خطاب ملتا ہے مثلاً نواب سیف الرحمٰن خاں (عہد ظفر) بھی موسیٰ خاں کہلاتے تھے[۱]، مگر عیسیٰ خاں بھی متوازی خطاب رہا ہو یہ کہیں نہیں دکھیا۔

دوسری منطقی غلطی یہ ہے کہ دو خطاب ایک ہی خاندان میں دو بھائیوں پر "اتر" ہی نہیں سکتے اگر الف اور ب دو بھائی تھے جنھیں عہد تغلق میں خطاب ملا اور پھر اُن کی اولاد میں منتقل ہوتا رہا تو عہد ظفر تک آتے آتے دونوں بھائی کہاں رہے ہم جدّ ہوئے۔ اگر یہ دستور رہا تھا کہ دو حقیقی بھائیوں میں یہ خطاب چلتا رہے تو کیا ضرور ہے کہ تغلق سے ظفر تک ساری پشتوں میں دو حقیقی بھائی پیدا ہوتے رہیں۔ اور یہ بھی مان لیں تو شروع سے آخر تک ایک بھائی کی اولاد محروم ہوتی چلی آئے گی۔

رہی یہ بات کہ عہد محمد شاہ اور احمد شاہ میں اس خاندان کے افراد قرآن پڑھاتے تھے۔ پڑھاتے ہوں گے تو اُن کا خطاب عیسیٰ خاں، موسیٰ خاں نہیں تھا اور تھا تو قرآن نہیں پڑھاتے تھے۔ اس عہد کی کسی کتاب میں ان کا حوالہ نہیں ملتا۔ عہد محمد شاہ میں خواجہ عیسیٰ تھے اُن کے باپ کا نام خواجہ موسیٰ تھا اور خطاب سربلند خاں، دادا کا بھی یہی خطاب تھا خواجہ موسیٰ کو معزالدین جہاندار شاہ کی بیٹی عفت آرا بیگم منسوب ہوئی تھی گویا خواجہ عیسیٰ جہاندار شاہ کے نواسے تھے[۲]

دوسرے میر عیسیٰ تھے۔ ان کا خطاب ہمت خاں تھا یہ قصۂ کامروپ فارسی کے مصنف ہیں اور امرائے عالمگیری میں سے تھے (وفات ۱۰۹۲ھ/۱۶۸۱ء)

---

(۱) گلدستۂ انجمن (طبع ۱۲۸۴ھ، مطبع اکبری دہلی۔ یہ ان مشاعروں کی روداد ہے جو موسیٰ خاں کے بیٹے احسان الرحمٰن خاں منعقد کیا کرتے تھے۔

(۲) تاریخ محمدی: ۱۱۸

ان کا بیٹا نیک نام خاں عہد محمد شاہ میں مرا ہے مشہور فارسی شاعر میر محمد افضل ثابت انھیں میر عیسیٰ کے بیٹے تھے (۱)۔ ظاہر ہے کہ یہ سب نام خارج از بحث ہیں پھر آخر وہ کون خاندان تھا جو اتنا "ممتاز" اور ایسا گمنام رہا؟

سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ "عیسوی خاں" کسی کا نام نہیں ملتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ کوئی معروف شخصیت نہیں تھے۔ اگر دربار سے کچھ تعلق ہوتا تو کتابوں میں حوالہ آتا، شاعر ہوتے تو تذکروں میں ملتے، مصنف ہونے کی صورت میں بھی ضمناً کچھ احوال کہیں سے دستیاب ہو سکتا تھا۔ گویا "عیسوی خاں" اگر قصے کے مصنف ہیں بھی تو غیر اہم اور غیر علمی شخصیت ہیں۔

قصے کو بغور پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ "تصنیف" بھی نہیں، دراصل ایک داستان ہے جو کسی داستان گو نے بیان کی ہے اُسے بجنسہ اُسی کے "ملفظ" میں لکھ لیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ عیسوی خاں کوئی داستان گو رہے ہوں، یا انھوں یہ داستان کسی اور سے سُن کر قلمبند کی ہو۔ جن حضرات نے میر باقر علی داستان گو کو سنا ہے وہ تصدیق کرتے ہیں کہ یہ داستان کا بیانیہ انداز ہے۔ دہلی میں آج بھی ایک دو حضرات ایسے موجود ہیں جو میر باقر علی کی داستان گوئی کا حال بتاتے ہیں اور جستہ جستہ عبارتیں سنا کر ان کی نقل اتار سکتے ہیں۔ اس فن کا کمال یہ تھا کہ داستان تو مختصر ہوتی تھی لیکن "بات کا بتنگڑ" بنایا جاتا تھا۔ مثلاً شہزادے کے کھانے کا ذکر ہوا تو ایک ہی سانس میں سو ڈیڑھ سو کھانوں کے نام گنا دیے، شکار کا بیان آیا تو شکار کے سیکڑوں اسلحہ اور

---

(۱) سفینۂ ہندی: ۴۴، سفینۂ خوش گو: ۲۲۲

(۲) [اس بات کی جانب خود میں نے مقدمے میں اشارہ کیا ہے۔ م ح خ] مسعود صاحب نے مقدمے میں لکھا ہے: پوری داستان بول چال کی زبان میں لکھی گئی ہے بلکہ غالباً جیسا کہ اس زمانے کا دستور تھا، لکھوائی گئی ہے جملوں کا دروبست تحریر کا نہیں تقریر کا ہے۔ (قصہ مہر افروز و دلبر، مقدمہ: ۱۳)

بھانت بھانت کے جانوروں کی فہرست بتادی۔ اسی طرح لباس، زیور، آتش بازی یا محل کے سازوسامان کی شرح بیان کردی۔ اس قصے میں تمام قرینے داستان گوئی کے موجود ہیں۔ اسے "تصنیف" سے زیادہ زبانی روایت کہنا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ داستان گو دہلی کا باشندہ معلوم نہیں ہوتا۔ الفاظ اس نے جس طرح ادا کیے ہیں اگر ویسے ہی قلم بند ہوئے ہیں تو کھڑی بولی کے علاقے (روہیل کھنڈ یا مغربی اضلاع) کا رہنے والا ثابت ہوتا ہے مجھے پروفیسر مسعود حسین خاں کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ "عیسوی خاں کا قلعے سے گہرا تعلق رہا ہے اور اس نے یہ قصہ کسی وقت ۳۲،۱ء تا ۵۹،۱ء کے درمیان لکھا ہوگا۔ اور یہ عیسوی خاں غالباً حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان کے چچا ہوں گے"۔ چونکہ حافظ غلام رسول خاں کا خطاب موسیٰ خاں تھا لہذا ان کے بھائی کا عیسیٰ خاں ہوگا۔" یہ دلیل قوی نہیں ہے۔ احسان کے چچا کا نام یا خطاب معلوم ہونا مشکل نہیں، اور عیسیٰ خاں فرض کرلیں تب بھی وہ "عیسوی خاں" نہ ہوئے۔ ان امور سے قطع نظر کرلیں تو بھی ان کا زمانہ کسی طرح عہد محمد شاہ نہیں ہوسکتا۔

قصّے کی زبان:

قصے کی زبان کا جیسا عالمانہ تجزیہ مسعود صاحب نے کیا ہے اُس پر میں کیا عرض کروں۔ لسانیات میرا موضوع نہیں، لیکن اتنا سمجھ سکتا ہوں کہ اس زبان میں نہ پنجابی کا اثر ہے نہ ہریانی کا۔ کھڑی بولی کے مغربی اضلاع کی چھاپ البتہ نظر آتی ہے۔ مسعود صاحب نے پہلے ہی صفحے پر متن یوں لکھا ہے:

"اس شہر کے بیچ کدھے عید اور شادی نہ معلوم ہوتی تھی کیوں کہ عید

---

(۱) متن کی قرأت میں جہاں مجھے اختلاف ہے وہ کل عبارتیں یہاں پیش نہیں کی گئیں اور طوالت کے خوف سے انھیں نظر انداز کر دیا گیا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ میری قرأت ہی صحیح ہو۔

اور شادی دن رات رہتی تھی۔"

میں ان الفاظ کو عکس کی مدد سے یوں پڑھ رہا ہوں: "اس شہر کے بیچ کدھی عید اور شادی ۔۔۔۔۔۔۔ الخ"، مسعود صاحب، "کد" کو "کب" بتاتے ہیں میرا خیال ہے[1] یہ کدھی (= کبھی) ہے جو آج بھی میرٹھ اور مرادآباد کے عوام کی زبان پر ہے۔ اسی طرح یہ مثالیں:

جگہ" = تشدید سے لکھا گیا ہے۔ مغربی اضلاع میں آج بھی سنا جاتا ہے۔

تن = اُن، تیئں = اسے مرتب نے "تو" کا ہم معنی قرار دیا ہے۔ اس میں ضمیر واحد حاضر کے ساتھ علامت فاعلی ممزوج ہے یعنی تیں (تو + نے) ہے۔ سودا اور قائم وغیرہ نے اسے نظم کیا ہے": تیں چھوڑا کس کے بھروسے پہ کارواں مجھ کو" (قائم)۔ مغربی اضلاع میں خوب بولا جاتا ہے دہلی والے شاید ہی بولتے ہوں اب تو قطعاً سننے میں نہیں آیا۔ غالب کو ایک جگہ مغالطہ ہوا ہے انھوں نے "تیئں" کے استعمال سے کراہت کا اظہار کیا ہے حالانکہ وہ "تیں" کے خلاف لکھنا چاہتے تھے[2]

ایک جگہ لفظ "بساتے" آیا ہے: "اپنی بساتے بادشاہ کوں ظلم نہ کرنے

---

(1) [کدھی سے مجھے اتفاق نہیں۔ مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ "کد" "کب" کے لیے مستعمل رہا ہے۔ کدھی کے ساتھ جملہ یوں ہوگا: کدھی ہے عید اور کدھی شادی الخ۔ کدھی "کد" ہی کی تاکیدی شکل ہے۔ کد اور کدھی دونوں رائج رہے ہیں۔ م ح خ]

(2) تیں اور تیئں دو علاحدہ ضمیریں ہیں۔ تیں = تو (نے)، تیئں = آپ، خود۔ غالب نے "تیئں" ہی کے خلاف لکھا ہے۔ تیں (تو + نے) کا مفہوم مسلسل دکنی سے ملتا ہے اور شمالی ہند میں قدیم زمانے میں رائج رہا ہے۔ م ح خ] مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اس موضوع پر چند سال قبل رسالہ "تحریک" (دہلی) میں ایک مضمون "غالب اور تیئں" چھپ چکا ہے، اس سے رجوع کیا جائے۔

دے"، ص (۳۲)، اس پر فاضل مرتب نے لکھا ہے کہ "یہ ہندی لفظ وِسترت = پھیلاؤ کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور عربی لفظ بساط سے معنی اور تلفّظ میں بہت قریب ہے"۔ میری ناقص رائے میں اس کا ہندی لفظ وِستار (विस्तार) سے کچھ تعلّق نہیں، یہ عربی لفظ بساط ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے چونکہ املا میں لکھا گیا اس لیے کاتب نے ت سے لکھ لیا ہے[1]۔

کتاب میں نیلم کی جگہ نیلن ملتا ہے، میم کو نون سے اس طرح بدلنے کی مثالیں مغربی اضلاع میں پائی جاتی ہیں۔ اِتّی (اتنی) چھڑکتے اِی (= چھڑکتے ہی) یا جن الفاظ کے آخر میں ی ہو ان پر ی ن کا اضافہ کرکے جمع سالم بنانا (پَرییں)۔

کِتّے اِی (= کتنے ہی)، وہاں ہی (= وہیں) کو وہائیں کہنا، یہ سب مغربی اضلاع سے مخصوص[2] ہیں ایک عبارت یوں ہے:

"گلرخ بادشاہزادے کی خاطر نشاں کرتی ہے کہ تیں[3] خاطر جمع رکھ"۔ (ص ۱۳۵)

مسعود صاحب نے حاشیے میں بتایا ہے کہ "خاطر نشاں = دل جمعی و دل جوئی کے معنی میں ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں اسے اردو ترکیب بتایا ہے جو

---

(۱) [بساط اور بسات کے لیے دیکھیے فرہنگ آصفیہ جس سے میرے نقطۂ نظر کی تائید ہوتی ہے۔ دیہات میں "بسات" ہند۔ آریائی لفظ ہی بولا جاتا ہے یہ لفظ بولیوں تک میں رائج ہے۔ م ح خ]

(۲) [اگر بعض خصوصیات مغربی اضلاع میں پائی جاتی ہیں تو وہ اس کی تردید نہیں کرتیں کہ دہلی کی زبان میں نہیں پائی جاتیں بہرحال دہلی لسانی اعتبار سے میرٹھ کے ضلع سے مربوط ہے۔ م ح خ]

(۳) [دیکھیے یہاں تیں کے معنی = تو ہیں نہ کہ تو نے۔ م ح خ]

عوام میں خاطر جمع کے معنوں میں مستعمل ہے " نشا خاطر" بھی بولا جاتا ہے، میں اس عبارت کو یوں پڑھتا ہوں:

"گلرخ بادشاہزادے کے خاطر نشان کرتی ہے"(۱) .... خاطر نشان کا مطلب ہے اچھی طرح سمجھاتی ہے عوام میں جو "نشا خاطر" بولتے ہیں وہ "نزع خاطر" کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا مفہوم ہے دل کو ہر اندیشے سے خالی رکھنا۔ تم نشان خاطر رہو = (نزاع خاطر رہو) یعنی دل میں کچھ اندیشہ نہ لاؤ۔ اصل عربی لفظ نزع الخاطر ہے جسے اردو والوں نے نشا خاطر" بنایا ہے۔ خیر ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(الف) محمد حسین آزاد نے شاہ نصیر کے ذیل میں جو لطیفہ لکھا ہے اس سے فاضل مرتب نے بروایت آغا حیدر حسن دہلوی اور مرزا فرحت اللہ بیگ یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ عیسٰی خاں موسٰی خاں دو بھائی تھے اور ایک کا تخلص شہرت، دوسرے کا آفاق تھا، یہ صحیح نہیں۔

(ب) اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ عیسوی خاں (یا عیسٰی خاں؟) ہی قصے کے مصنف ہیں۔ اگر ہیں تو انھوں نے اس کو تصنیف کے طور پر قلم بند نہیں کیا بلکہ یہ داستان گو تھے اور کسی شخص نے ان کی داستان کو اس التزام کے ساتھ لکھ لیا ہے کہ جس طرح وہ بولتے جائیں ویسے ہی الفاظ لکھ لیے جائیں۔ یا داستان گو کوئی اور مجہول شخص ہے قلم بند کرنے والے عیسوی خاں ہیں۔

(ج) اس قصے کا لسانیاتی مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ اس کا لکھنے (یا بولنے) والا مغربی اضلاع کا باشندہ ہے اس کی زبان پر میرٹھ، مظفر نگر، سہارن پور مراد آباد اور بجنور کی بولیوں کا گہرا اثر معلوم ہوتا ہے۔

---

(۱) [یہ موقع کے مطابق نہیں اس لیے کہ شاہزادہ ڈر رہا ہے اور گلرخ اس کی دلجمعی کر رہی ہے نشا خاطر اسی لیے بولا بھی جاتا ہے۔ م ح خ]

(۲)

اس بحث کے بعد بھی دو باتیں حل نہیں ہو سکیں: ایک تو یہ کہ عیسوی خاں کون ہیں؟ دوسرے ان کا زمانہ کیا ہے؟ کتاب چونکہ اردو کی قدیم بولی میں ہے اس لیے زمانے کی اہمیت خاص طور سے اور بھی بڑھ جاتی ہے جب کوئی کھلی ہوئی شہادت یا سند موجود نہ ہو تو قرائن ہی رہ نمائی کرتے ہیں۔ میں نے اس موضوع پر غور کرنے کے بعد جو نتیجہ برآمد کیا ہے فاضل مرتّب کے ملاحظے کے لیے اُسے بھی پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

فرید الدین آفاق اور امیر بخش شہرت کا حوالہ اوپر آچکا ہے۔ پہلے ان کا مختصر تعارف ضروری ہے:

سادات کا ایک چھوٹا سا خاندان کشمیر سے آکر دہلی میں بس گیا تھا، اس خاندان کے ایک فرد عیسیٰ خاں بھی تھے[1]۔ ان کی بہن کی شادی شاہ سلیمان ساکن جلال آباد (مظفر نگر) کے خاندان میں سید بہاء الدین سے ہوئی تھی[2] جن کے بطن سے میر فرید الدین پیدا ہوئے۔ ان کا تخلّص آفاق تھا[3] اور یہ حکیم ثناء اللہ خاں فراق کے شاگرد تھے[4]۔ خود عیسیٰ خاں کے ایک فرزند امیر بخش تھے یہ شہرت

---

(۱) مجموعہ نغز ۱: ۳۸ [نیز ترجمہ گلستان (اردو خطی نسخہ انجمن ترقی اردو پاکستان کا دیباچہ]

(۲) کریم الدین: طبقات شعرائے ہند: ۳۵۲

(۳) آفاق کا انتقال ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء میں ہوا جیسا کہ شمس الدین فیض کے مستخرجہ مادّہ تاریخ: [ز انقضائے آفاق آفاق رفت] سے ظاہر ہے۔ فہرست مخطوطات انجمن مرتبہ افسر امروہوی ۱/۳۴۵

(۴) مجموعہ نغز ۱: ۳۸ عمدہ منتخبہ: ۱۰۹۔ خوشگی اور شیفتہ نے بھی ان کا ترجمہ لکھا ہے۔ درگا پرشاد نادر دہلوی نے انھیں "جلال آبادی" بتایا ہے۔ خزینۃ العلوم: ۱۰۱

تخلّص کرتے تھے اور یہ بھی شناء اللہ فراق سے اصلاح لیتے تھے[1]۔ شہرت آفاق کے ماموں زاد بھائی تھے[2] مگر اس طرح رہتے تھے کہ عام طور سے انھیں حقیقی بھائی سمجھا جاتا تھا۔ یہ دونوں ہی شاہ فخرالدین دہلوی (ف ۱۱۹۹/۸۵-۱۷۸۴ء) سے سلسلۂ چشتیہ نظامیہ میں بیعت تھے[4] اور تصنیف و تالیف کا کام بھی اشتراک سے کرتے تھے[5]

شہرت خاصے شوخ طبع تھے۔ حکیم قدرت اللہ قاسم نے لکھا ہے کہ میرے منع کرنے کے باوجود[6] ایک مشاعرے میں شاہ نصیر دہلوی سے بگڑ گئے، اس لیے کہ شاہ نصیر اور فراق میں ادبی چشمک رہتی تھی آزاد نے جو واقعہ لکھا ہے[7]: ہوئی آفاق میں شہرت کہ عیسیٰ خاں کا گھر موسا

اس میں آفاق یہی میر فریدالدین ہیں، شہرت امیر بخش ہیں اور عیسیٰ خاں شہرت کے باپ اور آفاق کے ماموں ہیں۔ موسا (موسنا = صفایا کرنا) شاید محض عیسیٰ کی رعایت سے بطور ایہام آیا ہے یہ ان دونوں کی ہجو ہے جو اپنے استاد شناء اللہ خاں فراق کی طرف سے شاہ نصیر سے مہاجاۃ کرتے تھے۔

آفاق شہرت اور عیسیٰ خاں تینوں حیدرآباد چلے گئے تھے وہاں نواب مشیرالملک[8]، نواب شمس الامراء بہادر[9] اور مہاراجا چندو لال شاداں سے وقتاً

---

(۱) مجموعہ نغز ۱: ۳۵۴ (۲) مجموعہ نغز ۱: ۳۵۴

(۳) غالباً آفاق نے قادری سلسلے میں شاہ سلیمان قادری جلال آبادی سے بھی بیعت کی تھی (گلستاں اردو منظوم مخطوطہ انجمن کراچی)

(۴) دیکھیے فہرست مخطوطات انجمن کراچی مرتبہ افسر امروہوی جلد اول طبع ۱۹۶۵ء (۵) مجموعہ نغز ۱: ۳۵۴

(۶) آب حیات: ۴۱۲ (طبع دہم) (۷) یہ نواب ارسطوجاہ کا خطاب تھا

(۸) متوفی ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء (۹) متوفی ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء

فوقتاً توسل رہا۔ شاہ کمال کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرۂ مجمع الانتخاب کی تالیف سے دو سال قبل حیدرآباد آئے تھے۔ تذکرے کا زمانہ تالیف اسم تاریخی "مجموعۂ انتخاب" سے برآمد ہوتا ہے (= ۱۲۱۸ھ/۱۸۰۳ء) اس سے ظاہر ہے کہ ان تینوں کا سفر حیدرآباد ۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء میں ہوا۔ شمس الامراء کی ملازمت کے زمانے میں ان دونوں نے یہ کتابیں لکھیں۔ جو مشترک تصانیف ہیں ان کے سامنے صراحت کردی گئی ہے باقی صرف آفاق کی ہیں:

۱۔ دانش افروز (ترجمہ کلیلہ و دمنہ) یہ آفاق اور شہرت کی مشترک تصنیف ہے اس میں پندرہ ہزار اشعار ہیں۔ ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں لکھی گئی۔ قلمی نسخے آصفیہ (حیدرآباد دکن) اور انجمن ترقی اردو پاکستان کے کتب خانوں میں ہیں۔

۲۔ ترجمہ منطق الطیر (منظوم) یہ بھی دونوں کی مشترک تصنیف ہے تعداد ابیات ۴ ہزار سنہ ترجمہ ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء نسخہ خطی انجمن کراچی[1]۔

۳۔ چمنستان برکات[2]: (نظم) مناقب غوث اعظمؓ۔ ابیات ۱۱۶۷ تالیف ۱۲۲۷ھ/۱۸۱۲ء نسخہ انجمن (کراچی)

۴۔ گلدستہ مجلس[3] ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶ء

۵۔ گلستان منظوم اردو[4]۔ ابیات ۳۹۹۰ سنہ ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء خطی نسخہ انجمن کراچی۔

۶۔ دیوان ریختی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء

۷۔ مجموعہ قصائد
۸۔ مثنوی خواب و خیال } [5]
۹۔ کلیات آفاق

---

(۱) افسر امروہوی: فہرست مخطوطات اردو ۱: ۱۶ وغیرہ (۲) فہرست مخطوطات جلد اول: ۶۱
(۳) ڈاکٹر زور: داستان ادب حیدرآباد (بحوالہ افسر امروہوی) (۴) فہرست انجمن ۱: ۹۹-۵۱ (۵) ڈاکٹر زور: داستان ادب حیدرآباد

ان میں زیادہ تر تصانیف آفاق کی ہیں اور کچھ مشترک ہیں۔ شہرت کی علاحدہ[۱] کوئی تصنیف نہیں۔ عیسیٰ خاں ان کے ساتھ ہی حیدر آباد گیے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ضعیفی کا زمانہ تھا اُنھوں نے وہاں تصنیف و تالیف کا کام نہیں کیا یا وہ اس میدان کے مرد نہیں تھے۔

(۳)

شہرت اور آفاق کا اتنا تذکرہ تو ضمناً ہوگیا یہاں اصل شخصیت عیسیٰ خاں کی ہے جو امیر بخش شہرت کے باپ اور میر فرید الدین آفاق کے ماموں تھے! ان کے بارے میں شاہ محمد کمال نے یہ اطلاع دی ہے کہ یہ شاہ نظام الدین کے نائب تھے۔ شہرت کے ترجمے میں لکھا ہے:

"میر بخش خاں شہرت ...... ولد عیسیٰ خاں ...... کہ نائب صوبہ دہلی یعنی شاہ نظام الدین صاحب بودند۔ باعث نیرنگی زمانہ از سہ سال وارد حیدر آباد ہستند خود سابق بسرکار نواب شہریار الدولہ بہادر بسررشتہ روزگار بہ صیغۂ شاعری ممتاز و سرفراز ست و والد بزرگوار الیشان بسرکار نواب رفعت الملک بہادر بنوکری بیش قرار اند، سرفراز نست (کذا) و از فقیر باعث ہم وطنی ربط و اتحاد دلی دارند ...... حق تعالیٰ سلامت دارد ......"[۲]

اس سے معلوم ہوا کہ شہرت ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء میں نواب شہریار الدولہ کے ملازم تھے اور ان کے والد عیسیٰ خاں نواب رفعت الملک کی سرکار سے وابستہ تھے ہم وطنی کا جو کمال نے ذکر کیا ہے اس سے مغالطہ نہیں ہونا چاہیے۔ کمال کڑا مانک پور (الہ آباد) کے رہنے والے تھے اور آفاق و شہرت دہلی کے یہاں دونوں کا "ہندوستانی" ہونا مراد ہے یعنی دکن میں رہتے ہوئے یہ دونوں

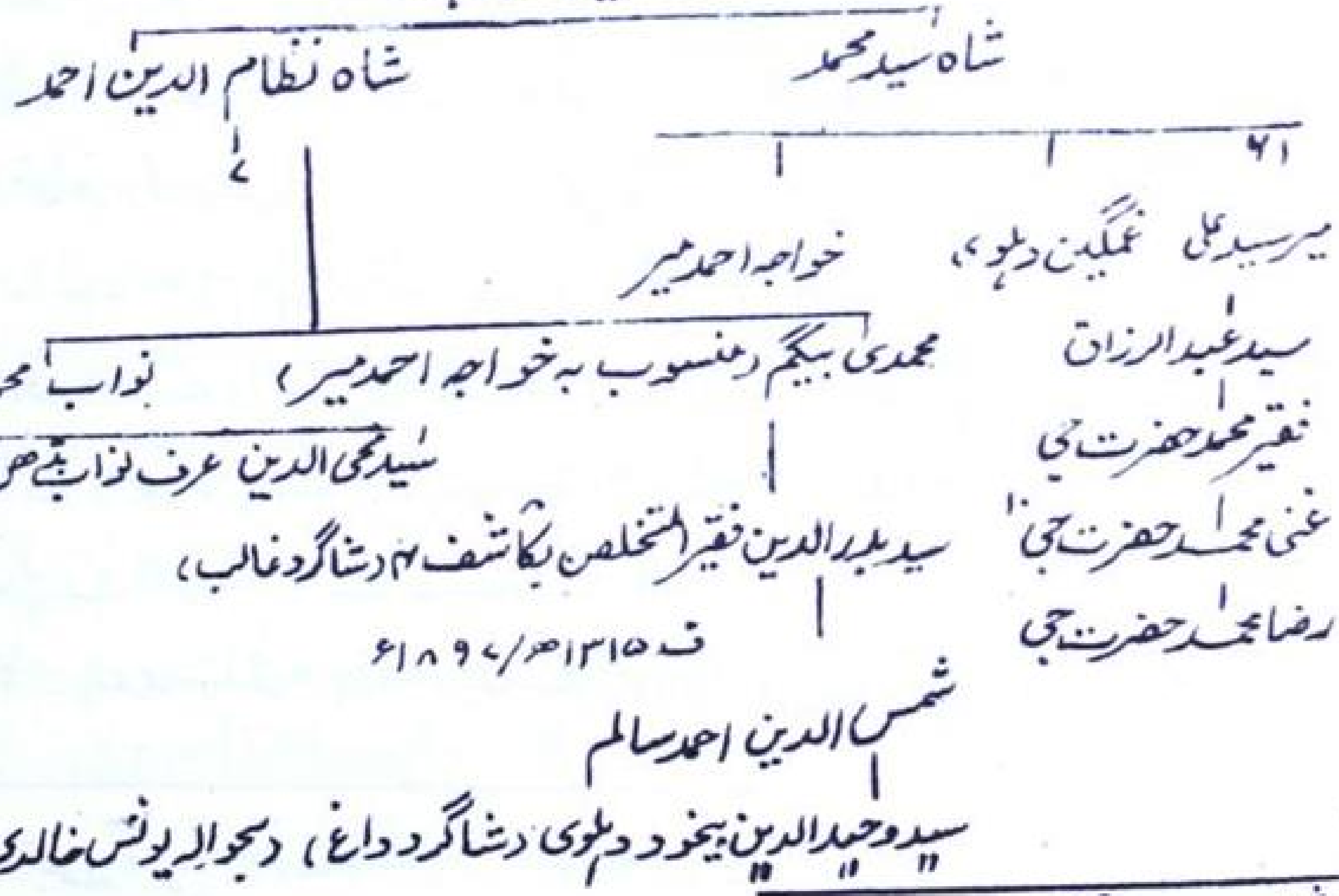
---

(۱) مجموعہ نغز ۱: ۳۵۴ (۲) نثار احمد فاروقی: تین تذکرے ۹۱

شمالی ہند کے تھے اس لیے ایک دوسرے کو ہم وطن سمجھا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ تالیف تذکرہ کے وقت ۱۲۱۹ھ/ ۱۸۰۴ء میں عیسیٰ خاں زندہ تھے اور دکن آنے سے پہلے یہ شاہ نظام الدین کے نائب تھے۔

اب تھوڑا سا حال شاہ نظام الدین کا بھی سن لیجیے: ان کا پورا نام سید شاہ نظام الدین قادری ہے[1]۔ نسباً قادری تھے اور مادری نسب حضرت خواجہ باقی باللہ دہلوی پر منتہی ہوتا ہے۔ دلی میں مادھوجی سیندھیا کے اقتدار کے زمانے میں یہ صوبیدار تھے[2]۔ اصطلاحاً حاکم صوبہ یعنی صوبیدار (گورنر) کو صرف "صوبہ" بھی کہتے ہیں[3]۔ "نائب صوبہ دہلی" کا یہاں یہ مطلب ہے کہ صوبیدار دہلی کے نائب تھے۔ شاہ نظام الدین دنیوی اقتدار کے ساتھ ہی دولت باطن سے بھی مالا مال تھے بہت دیندار، اوراد و وظائف میں مشغول رہنے والے صاحب سلسلہ بزرگ تھے[4]۔ یہاں مزید وضاحت کے لیے ان کا شجرہ درج کرتا ہوں:



اس شجرے سے سارا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ جب ۱۸۰۴ء میں جنرل لیک نے دہلی کو فتح کرلیا اور مرہٹوں کے اقتدار کا خاتمہ ہوگیا تو شاہ نظام الدین بھی برطرف ہوکر دہلی سے گوالیار چلے گئے، وہیں مہاراجا گوالیار نے ان کے لیے

حاشیہ ص ۲۶ (۱) مجموعہ نغز ۲: ۲۸۰، ان کے تفصیلی حالات ہم عصر تاریخوں میں مل جاتے ہیں۔ نیز رک: یونس خالدی "مطالعہ غمگین دہلوی"، شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند)

(۲)

(۳) دیکھیے ہندوستانی اردو لغت (ڈنکن فاربس) تحت لفظ "صوبہ"، جس کے معنی (گورنر) لکھے ہیں نیز

(۴) مجموعہ نغز ۲: ۲۸۱

(۵) خمخانہ جاوید ۱: ۶۵۵۔

(۶) سید علی غمگین دہلوی ثم گوالیاری وہی معروف شخصیت ہیں جن کے نام غالب کا خط پنج آہنگ میں موجود ہے اور بقیہ فارسی خطوط چند سال قبل دریافت ہوکر چھپ چکے ہیں۔ تفصیلات کے لیے رک: محمد مسعود احمد: حضرت غمگین غالب کی نظر میں۔ سہ ماہی اردو کراچی جلد ۳۸ شمارہ ۱، نیز فاران ستمبر ۱۹۵۹ء اور اردوئے معلی دہلی کا غالب نمبر حصہ اول

(۷) غالب کے ایک خط میں انھیں کا حوالہ ہے: "تمھارے ماموں نواب محمد میر خاں کے بڑے دوست ہیں" (بنام کاشف) خطوط غالب مرتبہ مہر ۶۰۰۔

(۸) سید بدرالدین احمد کاشف غالب کے دوست اور مکتوب الیہ ہیں ان کے نام غالب کے پانچ خطوط ملتے ہیں (مہر: خطوط غالب ۵۹۹ و بعدہ) مگر ان کے حالات نہ مہر صاحب کو ملے نہ مالک رام (تلامذہ غالب ۲۵۰) اور عبدالرؤف عروج (بزم غالب ۲۴۳) کو۔ یہ شاہ نظام الدین کے نواسے اور بیخود دہلوی کے دادا تھے۔ ان کے خاندانی

مدد معاش کا انتظام کر دیا تھا۔ میر سید علی غمگین دہلوی جن کے نام غالب کے متعدد خطوط دریافت ہو چکے ہیں انھیں شاہ نظام الدین کے بھتیجے تھے اور گوالیار میں حضرت جی کی خانقاہ بھی انھیں کی ہے جس کے کتب خانے میں "قصہ مہر افروز و دلبر" کا مخطوطہ رہا ہے اور جسے غمگین دہلوی کے سجادہ نشیں غنی محمد حضرت جی نے ۷ مئی ۱۹۲۹ء کو آغا حیدر حسن دہلوی کی نذر کیا تھا۔

جب یہ معلوم ہو گیا کہ عیسیٰ خاں شاہ نظام الدین قادری صوبیدار دہلی کے نائب تھے تو اب اس مخطوطے کے پہلے صفحہ پر رومن رسم الخط میں لکھی ہوئی عبارت[1]

(بقیہ ص ۲۷) حالات میں ایک کتاب سیرت العالمین عرصہ ہوا آگرہ سے چھپ چکی ہے۔

(۹) ان کا حوالہ بھی خطوط غالب میں ملتا ہے: نواب محی الدین خاں کا حال سن کر جی خوش ہوا، (مہر ۶۰۳) ان کا عرف بڈھن صاحب یا بڈھے صاحب تھا۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر نوش جاں کر کے بیک بینی و دوگوش بھرت پور چلے گئے۔" (مہر: خطوط غالب ۷۹) ۱۔ نیز ملاحظہ ہو بزم غالب عبدالرؤف عروج ۸۶۔

(۱۰) یہی غنی محمد حضرت جی ہیں جنھوں نے قصہ مہر افروز و دلبر کا مخطوطہ آغا حیدر حسن دہلوی کو دیا تھا۔

(۱) یہ عبارت اتنے بھدے اور بچکانہ خط میں ہے کہ کسی برطانوی یا فرانسیسی سے اتنے جناتی خط کی توقع نہیں کی جا سکتی یہ کسی ہندوستانی ہی کا خط ہے جو انگریزی رسم الخط سیکھنے کی مشق کر رہا ہے ممکن ہے سکھانے والا کوئی فرانسیسی ہو۔ اس میں لکھنے والے نے K کی جگہ q، s کی جگہ c لکھا ہے اس سے مسعود صاحب یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کسی فرنچ کا خط ہے میرا خیال ہے کوئی فرانسیسی q تنہا نہیں لکھے گا اس کے ساتھ ua بھی لائے گا۔ کاتب نے دعویٰ کو Daya لکھا ہے یعنی ﻻ کی آواز سے "وا" لکھنا چاہا ہے اسی سے ہندوستانی ہونا ظاہر ہے۔

[redacted]

(جو پہلے نقل ہو چکی ہے) دوبارہ پڑھیے:

"مالک اس کتاب کا نائب صاحب۔ جو کوئی دعویٰ کرے سو جھوٹا ہے"
معلوم ہوگا کہ "نائب صاحب" سے یہاں عیسٰی خاں مراد ہیں یہ کتاب اُن کی ملکیت رہی ہے کسی نے بعد میں اس پر "قصہ عیسوی خاں بہادر" لکھ دیا ہو اور سہواً عیسٰی خاں کی بجائے عیسوی خاں قلم سے نکلا ہے یا عرفاً یہ اسی طرح پکارے جاتے ہوں گے۔

اگر اسے عیسٰی خاں کی صرف "ملکیت" سمجھا جائے تب تو یہ قضیہ پھر باقی رہا کہ واقعی مصنف کون ہے؟ اور اگر یہ سمجھا جائے کہ عیسٰی خاں ہی نے یہ داستان قلم بند کرائی ہے تو اس کا زمانہ ان کے سفر حیدرآباد ۱۲۱۷ھ ۱۸۰۲ء سے قبل قرار پائے گا۔

میرا گمان ہے کہ عیسوی خاں (یعنی عیسٰی خاں) نے ہی یہ داستان لکھوائی ہے اور یہ انیسویں صدی کے آغاز یا اٹھارہویں صدی کے عشرہ آخر میں لکھی گئی ہے۔ میں نے جو یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ مصنف اضلاع مغربی کا باشندہ ہے اس کی تصدیق اس امر سے بھی ہو جاتی ہے کہ عیسٰی خاں کا خاندان بھی بخارا سے آکر کشمیر میں آباد ہوا۔ وہاں سے کچھ افرادِ خاندان دلی آ گئے یہاں

---

(۱) دلی میں امیر بخش شہرت کے دادا یعنی عیسٰی خاں کے باپ آئے تھے۔
اعظم الدولہ سرور نے لکھا ہے: "از دو پشت بزرگانش بدار الخلافہ شاہ جہاں آباد توطن اختیار کردند" (عمدہ منتخبہ۔ ۳۹) اس تذکرے کا مطبوعہ متن سخت ناقابل اعتبار ہے اگر دہ پشت کا دو پشت ہو گیا ہو تو تعجب نہیں کرنا چاہیے۔ بیشک عیسٰی خاں کی زبان پر کھڑی بولی کے اثرات دیکھ کر ہوتا ہے۔ اگر تذکرہ سرور میں "دو پشت" صحیح لکھا ہے تو پھر عیسٰی خاں کو بھی مصنف نہیں صرف "مالک کتاب" کہا جائے گا۔ اس لیے یہ مسئلہ ہنوز غور طلب رہتا ہے۔

سے جلال آباد چلے گئے۔ جلال آباد میں کچھ معافیداری کسی کو مل گئی ہوگی یوں بھی دہلی پر آئے دن یورشیں ہوتی رہتی تھیں اس لیے شرفا، قصبات میں رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ جلال آباد دہلی سے باغپت، شاملی ہوکر سہارن پور جانے والی سڑک پر آباد ہے[1] اور مظفر نگر سے بیس میل ہے۔ غوث گڑھ کا قلعہ بھی یہاں سے قریب ہے جسے ضابطہ خاں نے بنایا تھا مرہٹوں نے ضابطہ خاں سے جنگ کے زمانے میں (۱۱۸۵ھ/۱۷۷۱ء) اس پر قبضہ کر لیا تھا عیسیٰ خاں کا تعلق شاہ نظام الدین سے اسی زمانے میں پیدا ہوا ہوگا۔

کتاب کی زبان تائید کر رہی ہے کہ مصنف مظفر نگر اور سہارن پور کی بولی سے خاصا متاثر ہے۔ کتاب پر "نائب صاحب" کا حوالہ ہے، مخطوط بھی شاہ نظام الدین قادری کے خاندان سے ملا ہے ان سب قرائن کے ہوتے ہوئے یہی سمجھنا چاہیے کہ عیسیٰ خاں نے یہ داستان قلم بند کرائی ہے اور یہ مخطوطہ زیادہ سے زیادہ ۱۷۵ سال پرانا یعنی ۱۸۰۲ء سے قبل کا ہے۔ آغا حیدر حسن تو اسے "عہد شاہ جہانی" کا بتاتے ہیں مگر مسعود صاحب نے لکھا ہے:

"اردو اشعار کی غیر موجودگی سے اس کی قدامت اور مسلم ہو جاتی ہے اور یہ قیاس کہ یہ قصہ محمد شاہ کے عہد کی تصنیف ہو سکتا ہے صحیح ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت شمالی ہند میں اردو شاعری کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی[2]"
[مقدمہ ص ۱۵]

---

(۱) امپیریل گزیٹیر آف انڈیا جلد ہفتم ۔ ۷۷

(۲) اگر اردو اشعار کا قصے میں نہ ہونا قدامت کی دلیل ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو شاعری میں سرمایہ نہیں تھا تو فارسی کے اشعار بھی قصے میں نہیں ہیں اسی دلیل سے یہ فارسی شاعری کے آغاز ہونے سے پہلے کی تصنیف قرار پا سکتی ہے۔

محمد شاہ کا عہد ۱۱۶۱ھ/۱۷۴۸ء میں ختم ہوا ہے مگر یہ قصہ اس سے کم ازکم نصف صدی بعد لکھا گیا ہے البتہ فورٹ ولیم کالج کی داغ بیل پڑنے سے پہلے وجود میں آچکا ہوگا۔

ایک اور قرینہ بھی اس خیال کو تقویت دیتا ہے۔ دہلی میں مادھوجی سیندھیا (گوالیار) کا عروج غلام قادر روہیلہ کے بعد ہوا ہے جس نے ۱۲۰۲ھ/۱۷۸۸ء میں شاہ عالم کو نابینا کر دیا تھا سیندھیا نے غلام قادر کو گرفتار کر کے ہلاک کیا، شاہ عالم کو دوبارہ تخت نشیں کیا اور کل امور سلطنت اپنے قبضے میں لے لیے۔ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے پہلے علی گڑھ کے قلعہ کا محاصرہ کیا یہاں سیندھیا کی طرف سے جنرل پیرون انچارج تھا اسے ۲۹ راگست کو قلعہ لارڈ لیک کے حوالے کرنا پڑا اور خود مستعفی ہو کر لکھنؤ چلا گیا۔ اب لارڈ لیک نے آگرہ قلعہ چھینا اور ۱۷ راکتوبر ۱۸۰۳ء کو اس پر بھی قابض ہو گیا وہاں سے دہلی کا رخ کیا اور بادشاہ کے اختیارات محدود کر کے اسے قلعے میں نظر بند رہنے دیا باقی کل ممالک محروسہ پر کمپنی بہادر کا قبضہ ہو گیا یہی زمانہ دہلی سے مرہٹوں کا نفوذ ختم ہونے کا ہے اسی زمانے میں شاہ نظام الدین دہلی سے گوالیار گئے ہیں گویا عیسیٰ خاں کی ملازمت (نیابت صوبہ) ختم ہوئی ہے اور انھیں تلاش معاش کے لیے حیدر آباد کا رخ کرنا پڑا ہے۔

مسعود صاحب نے مقدمے میں جنرل پیرون کا تذکرہ بھی کیا ہے کہ یہ مخطوطہ شاید اس کے پاس رہا ہو۔ لیکن اس کا امکان بہت کم ہے اس لیے کہ پیرون کا یہ دور علی گڑھ میں گزرا ہے اور وہاں سے وہ لکھنؤ گیا ہے۔ مخطوطے پر رومن رسم الخط میں ایک عبارت اور بھی لکھی ہوئی ملتی ہے جس کے آخری الفاظ "دے دی ہے" پڑھے جاتے ہیں۔ اس عبارت کا متعین کرنا بھی

---

(۱) بیل: مفتاح التواریخ ۵۶۳

ضروری ہے جس سے مزید دلائل مل سکتی ہیں میں نے تھوڑا سا دماغ کھپایا تو بس اتنا سمجھ سکا کہ یہ کوئی غزل ہے جس کی ردیف " دے دی ہے" اور قافیہ میم پر ختم ہونے والا ہے مگر اسے عکس کی مدد سے پڑھنا دشوار ہو رہا ہے۔ اصل شاید زیادہ واضح ہو۔

(۲) اس تبصرے کو ملاحظہ فرماکر پروفیسر مسعود حسین خاں نے جو خط مجھے لکھا تھا اس کا اقتباس: "...... میں نے آپ کے فاضلانہ مضمون کو بغور پڑھا، واقعی عیسٰی خاں کے سلسلے میں آپ نے ایک نیا نکتہ پیدا کیا ہے، میں شہرت اور آفاق کے حیدرآباد میں وروو تک تو پہنچ گیا تھا لیکن مجھے اس کا علم نہ ہو سکا کہ ان میں سے ایک کے والد کا نام عیسٰی خاں بھی تھا اور وہ نائب کی حیثیت سے معروف تھے۔ میں نے تو اپنے مقدمے میں ساری راہیں کھلی رکھی ہیں اور کہیں اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ میں نے مصنف کو پکڑ لیا ہے۔ البتہ آغا صاحب کے "طوطا مینا" کا ذکر کرتے وقت آپ یہ بھول جاتے ہیں کہ فرحت اللہ بیگ کا تعلق بھی اسی خاندان سے رہا ہے وہ اس قدر غیر مستند نہیں۔ ان کے خاندان میں عیسٰی خاں موسٰی خاں کی روایت اسی طرح مستحکم ہے۔ ایک اور شخص جو اس خاندان کے نواسے یا پرنواسے رہے ہیں عظمت اللہ بیگ ہیں لیکن میں ان کے خاندان کے زندہ اصحاب تک نہیں پہنچ سکا۔ بہرحال مصنف کے بارے میں آپ کی یہ سعی بہت مدلل ہے اور تاریخی واقعات سے مربوط بھی۔ جہاں تک آپ کی قرأت متن کا تعلق ہے اس سے مجھے اختلاف ہے جو میں نے جابجا حاشیے میں درج کر دیا ہے آپ اس عہد کی دلی کی زبان اور دوآبے کی زبان کو مختلف سمجھتے ہیں اور میں ایک سمجھتا ہوں۔ مجھے اس بات کا بھی یقین ہے کہ قصۂ مہر افروز کی زبان فورٹ ولیم کالج کے مصنفین کی زبان سے کم از کم پچاس سال قبل کی (شاید اس سے بھی قبل کی) زبان ہے اس لیے کہ اس میں بہت سے ایسے الفاظ موجود ہیں جن کا تسلسل دکنی اردو سے ملتا ہے لیکن بہرحال میں اسے عہد محمد شاہی سے قبل لے جانے پر تیار نہیں جیسا کہ آغا صاحب کا خیال تھا ....." [۲ جنوری ۱۹۷۱ء]

اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت

اردو زبان و ادب کی کم سنی کو دیکھتے ہوئے اس میں طنز و مزاح کا سرمایہ خاصا وقیع ہے اور یہ بات بے خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ہندستان کی دوسری علاقائی زبانیں اس مخصوص میدان میں اردو سے پیچھے ہیں۔ اس کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں لیکن سب سے قوی سبب یہ ہے کہ اردو اس وقت علمی اور کتابی زبان کی حیثیت سے نمودار ہوئی جب ہند ایرانی تہذیب اپنے ارتقاء کو پہنچ چکی تھی اور طنز و مزاح کا تعلق معاشرت کے مسائل سے ہے۔ جب تک انسان کا شعور اتنا بالغ نہ ہو کہ وہ گرد و پیش کی بے ہنگم باتوں پر ہنس سکے بلکہ خود اپنا بھی خاکہ اڑا سکے اس وقت تک وہ طنز و مزاح کی روح کو نہیں سمجھ سکتا۔ طنز یا مزاح بے معنی ہنسی کا نام نہیں ہے یہ گہرے عرفان ذات یا معاشرہ کے شعور سے پیدا ہوتا ہے۔ اردو زبان کی یہ خصوصیت کہ وہ مغلوں کے دور زوال میں پیدا ہوئی اس کے لیے ایک افادیت کا پہلو بھی رکھتی ہے چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اردو میں شعر گوئی کا باقاعدہ آغاز ہونے سے پہلے ہی طنز و مزاح کی صنف وجود میں آ چکی تھی جس کی مثال میں جعفر زٹلی کا کلام پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں اردو اور فارسی ترکیبوں کی مضحکہ خیز آمیزش یہ اشارہ کر رہی ہے کہ مقامی زبان فارسی سے

اسلوب دادا کے وسیلے چھین رہی ہے۔ جعفر کا اسلوب ہی مضحک نہیں ہے اس نے اپنے دور کی سیاست اور سماج پر بھی نشتر زنی کی ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جو اخلاقی انحطاط اور سیاسی زوال کی علامتیں ابھر کر آئی ہیں ان کے اثرات جعفر کی شاعری میں نمایاں طور سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ پھر جب فارسی گوئی کا رواج کم ہوا اور ہندی نژاد شاعروں کو اپنی مقامی زبان میں شعر کہنے کا احساس ہوا تو اس کا آغاز بھی ایک ایسے اسلوب سے ہوا جسے ہم کسی حد تک طنز و مزاح کے ذیل میں رکھ سکتے ہیں۔ یعنی ایہام گوئی۔ یہ لفظوں کی بازی گری جس میں ایسے لفظ کا انتخاب کیا جاتا ہے جس کے دو معنی ہوں۔ ایک تو فوری طور پہ ذہن میں آتے اور دوسرا ذرا اوٹ میں رہے اور شاعر کا مقصود وہی معنی بعید ہو۔ ایہام گوئی کی روش زیادہ عرصے تک نہ چل سکی اور خود ایہام گو شاعروں کو اس کے فضول ہونے کا بہت جلد احساس ہو گیا تھا مگر اس کے بعض فائدے یقیناً ہوئے۔ اوّل تو زبان کی وسعت اور امکانات میں اضافہ ہوا دوسرے اردو شاعری سے عوامی دلچسپی پیدا ہوئی۔ ایہام کے "دل کو کھینچنے" کا ثبوت میر کی شاعری سے بھی ملتا ہے۔ آج بھی کسی ایہام گو شاعر مثلاً ناجی یا آبرو کا دیوان اٹھا کر پڑھیے تو وہ سنجیدہ شاعری کی نہیں بلکہ طنز و مزاح کی کتاب معلوم ہوتی ہے۔

دورۂ ایہام گویاں کے بعد سر فہرست نام حاتم، سودا، میر، میر سوز وغیرہ کے آتے ہیں۔ حاتم کے کلیات میں ایک ایسا نمونہ بھی ملتا ہے جسے ہم اردو نثر میں مزاح کا قدیم ترین نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک نثر پارہ ہے جس کا عنوان ہے "نسخہ مفرح الضحک معتدل"۔ اسے شاہ کمال نے تذکرہ مجمع الانتخاب میں بھی نقل کیا ہے۔ اردو نثر میں مزاح کا اس سے زیادہ قدیم نمونہ میری نظر سے نہیں گزرا اس لیے یہاں نقل کرتا ہوں

"چاندنی کا روپ دوپہر کی دھوپ چڑیل کی چوٹی کھٹنے کی لنگوٹی

پریوں کا گزر دیو کی نظر۔۔۔ تیس تیس ٹکے بھر۔کبوتر کی غٹرگوں مرغی کی ککڑوں چیل کی چل چل کیڑوں کی کل کل۔ جوگا پی شتر بکرے کی میں کوّے کی ٹیں آٹھ آٹھ رتی۔۔۔۔ ان سب دواؤں کو لے کر نہ رات ہو نہ دن ہو نہ صبح ہو نہ شام ہو باسی پانی نہ تازہ پانی۔ اوس میں سکھا کر کالی کی سل پر ممنی کی بٹّی سے پیسے۔ پھر مکڑی کے جالے کی صافی میں چھان کر فرشتے کے موت میں خشخش کے ساتویں حصّے برابر گولی باندھے۔ وقت نزع کے بطخ کے دودھ سے ایک کفِ پا پھانکے۔ کھانے پینے سونے بیٹھنے دیکھنے بولنے سننے سونگھنے سے پرہیز کرے۔ جب خوب بھوک لگے تو نوّے ہزاروں سے زیادہ نہ کھائے۔ حاتم کہے ایک روگ سے ستّر روگ کو پیدا کرے۔"

سودا کے سامنے ہجو کا وسیع میدان تھا اور انھیں زبان و بیان پر قدرت کاملہ حاصل تھی لہذا انھوں نے جہاں قصیدے لکھ کر انوری و خاقانی کا تتبع کیا ہے وہیں فارسی کے ہجو گو شعرا کے نمونے کی ہجویات بھی لکھی ہیں۔ انھوں نے اکثر شخصیات ہی کو مورد طعن بنایا ہے لیکن ان کی بعض ہجویہ نظمیں ایسی بھی ہیں جن سے اس عہد کی سماجی ابتری اور نظام زندگی کی ناہمواری کا احساس ہوتا ہے۔ "قصیدۂ تضحیک روزگار" "ہجو شیدی فولاد خاں کوتوال" یا "قصیدۂ شہر آشوب" سے مثالیں دینے کی ضرورت نہیں۔ ان سے ہم یہ ضرور سمجھ سکتے ہیں کہ سیاسی اور سماجی مسائل پر طنز کرنے کی جو ابتدا جعفر زٹلی نے کی تھی اسے سودا نے آگے بڑھایا ہے۔ میرؔ نے بھی ہجویں اور شہر آشوب لکھے ہیں۔ اسی طرح ہمیں عہد متوسّط کے شعرا میں میر حسن، قائم چاندپوری، بقا اکبر آبادی انشا، مصحفی جرأت اور نوا بدایونی کے کلام میں ہجویات کا عنصر ملے گا ان میں بعض ہجویں جو ذاتی رنجش کے زیر اثر لکھی گئیں۔ رکیک ہیں لیکن جہاں موضوع میں عمومیت پیدا ہو گئی ہے یا ہجو کا موضوع شخصیات نہیں ہیں وہاں طنز و مزاح کے اچھے نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ یہاں مثالوں

کی جگہ صرف اشاروں پر اکتفا کیا گیا ہے تفصیل کے لیے ان شعراء کے دواوین سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ قائم چاندپوری نے بھی بہت رکیک ہجویں لکھی ہیں مگر ان کی بعض بیانیہ مثنویاں جیسے "در ہجو موسم سرما" جو غلطی سے کلیات سودا میں شامل ہو گئی ہے یا مثنوی در ہجو برسات عہد وسطیٰ کی اردو شاعری میں طنز و مزاح کے اچھے نمونے ہیں۔ اردو شاعری کو فارسی زبان و ادب سے وراثت میں بہت کچھ ملا۔ تمام بحریں اور اوزانِ فارسی کے تھے۔ استعارے اور تشبیہات تلمیحات اور محاورے اسی طرح اصنافِ سخن مثلاً قصیدہ مرثیہ مثنوی قطعہ رباعی وغیرہ یا موضوعات جیسے شہر آشوب ہجو۔ اسی طرح رموز و علائم بھی فارسی ہی کے رائج ہوئے ان میں کہیں کہیں اپنے ماحول کے مطابق ترمیم کر لی گئی ورنہ بجنسہ اپنا لیے گئے مثلاً واعظ اور زاہد کا تمسخر شیخ سے چھیڑ چھاڑ محتسب کو لتاڑنا وغیرہ۔ اس کے ساتھ ہی تسبیح و زنّار کعبہ و بتخانہ مسجد و میکدہ بھی شاعرانہ علامتوں کے طور پر کثرت سے استعمال ہوئے ہیں اس کے پیچھے صدیوں کی معاشرت کا تاریخی سفر، نظریات کا تصادم اور عربی و فارسی شاعری کی روایات کام کر رہی ہیں۔ بلکہ فارسی میں بھی یہ روایت عربی شاعری سے آئی ہے۔ عباسی خلفاء کے زمانے میں دولت کی ریل پیل نے طبقۂ امراء میں عیش کوشی اور فسق و فجور کو عام اور ارزاں کر دیا تھا۔ عربی شاعری میں اس وقت دو میلانات غالب تھے ایک "بابر بہ عیش کوش" والا جس کے نمائندے ابونواس حمدانی اور بشار بن برد جیسے شعراء ہیں اور دوسرا زہد و ورع کی تبلیغ کرنے والا۔ اس طبقہ کا نمائندہ شاعر ابوالعتاہیہ ہے۔ اسی طرح عجمی فلسفہ و افکار کی اشاعت سے ایمان اور زندقہ کی لہریں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ عقلیت پرستی کی رو آئی تو اس نے یہ شعور پیدا کیا کہ مذہب کا ظاہر یا (letter) اتنا اہم نہیں ہے جتنا اس کی روح (spirit) قابل تقلید

ہے۔ یہاں طریقت اور شریعت کی بحث نے بھی اس تصادم کو اور کچھ بڑھا دیا۔ اب گویا "زاہد" یا "شیخ" یا واعظ تو اس طبقہ کا نمایندہ بن گیا جو مذہب کے لفظ (letter of the law) اور رسوم ظاہر کو سب کچھ سمجھتے ہیں اور "صوفی" یا عاشق یا رند اس گروہ کا نمایندہ ہوا جس کی نظر ظاہری رسوم پر نہیں بلکہ "اصل مقصود" یا روح (spirit of the law) پر ہے اور اسی کو وہ "عشق" سے تعبیر کرتے ہیں۔ فارسی میں یہ سب تلمیحات اور علامتیں عربی سے داخل ہوئیں اور فارسی سے اردو والوں نے حاصل کیں تو یہاں بھی "دیر" یا "بت کدہ" یا "زنار" اور قشقہ عشق کی علامتیں بن گئے اور تسبیح وسجادہ یا حرم یا مسجد ظاہر پرستی کی۔ رفتہ رفتہ ان کو لوازمات شعری کا درجہ حاصل ہوگیا اور شاید ہی کوئی غزل متقدمین شعراء کے دیوان میں ایسی نکلے جس میں یہ علامتیں برتی نہ گئی ہوں۔ اس لحاظ سے ہم پوری اردو غزل کیا تمام اصناف سخن کا جائزہ لے سکتے ہیں کہ اس میں شیخ وزاہد کی پگڑی کس طرح اچھالی گئی ہے۔

ایک اور روایت اردو شاعری کو مبالغہ آرائی کی ملی قصیدہ میں ممدوح کی شجاعت سخاوت اور مکارم اخلاق کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا جاتا تھا تاکہ زور کلام پیدا ہو وہاں یہ معیوب نہیں مستحسن بلکہ ایک حد تک ضروری ہے۔ اس لیے کہ اگر مدح میں صرف "بیان واقعہ" پر اکتفا کیا جائے تو وہ مدح نہیں بلکہ "اخبار دربار معلی" قسم کی چیز ہو جائے گی۔ مگر اس مبالغہ نے اپنے اثر میں غزل کو بھی لے لیا اور عاشق کی نامرادی اور محبوب کی "صفات حسنہ" کا ایسا بیان ہونے لگا جس کی شکایت میں مولانا حالی کو مقدمہ لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ یہ مبالغہ آرائی بھی ہماری روایات ادبی کا ایک جزو بن گئی۔

ایک اور روایت جو ہمیں فارسی بلکہ عربی سے ملی ہے شاعروں کی

معاصرانہ چشمک اور نوک جھونک ہے۔ عربی میں تو جریر اور فرزدق اور الاخطل کے "نقائض" (جھڑپیں) ایک پورا موضوع ادبی تاریخ کا ہیں اور ان پر مستقل کتابیں لکھی گئیں۔ فارسی کے شعرا بھی اس میدان میں عربی والوں سے پیچھے نہیں رہے اور اس معاملۂ خاص میں اردو نے بھی فارسی کا "حق نمک" ادا کرنے میں کسر نہیں کی۔ چنانچہ اردو شاعری کے آغاز ہی سے ہمیں شاعروں کی چشمکیں اور معرکے ملنے لگتے ہیں۔ شاہ مبارک میرزا مظہر سودا اور ضاحک یا سودا اور فدوی میر اور خاکسار یا میر اور بقا اسی طرح مصحفی اور انشاء اور ناسخ و آتش یا ذوق و غالب کے معرکے اردو شاعری کو بعض دل چسپ تخلیقات دے گئے ہیں۔ ان ہجویات میں جتنا حصہ ادبی لحاظ سے قابل اعتنا رہے وہ ہمارے طنز و مزاح کے سرمائے میں خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ ان معرکوں میں سب سے زیادہ مواد "مصحفی و انشاء" کی جھڑپوں کا محفوظ ہے اور اسے تقریباً ہر تذکرے اور تاریخ میں نقل بھی کیا جاتا ہے اور ان کی روشنی میں انشاء اور مصحفی کی شاعرانہ صلاحیتوں کا موازنہ کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ اس کے دو پہلو ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ معرکہ میں "جارحیت" کا مرتکب کون ہوا، زیادتی کس نے کی اور کون بے قصور یا مظلوم ہے یہ ہمارا فی الوقت موضوع نہیں حالانکہ اس پہلو سے ابھی تک جن حضرات نے ان معرکوں کا جائزہ لیا ہے وہ اپنا رویہ منصفانہ رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ دوسرا پہلو ان معرکوں کے مطالعہ کا یہ ہے کہ ہجویں کس کی کامیاب اور برجستہ ہیں تو اس میں شک نہیں کہ انشاء کا پلہ بھاری ہے۔ وہ طبعاً ہنسوڑ ہیں اور ان کا اسلوب غزل میں بھی ایسا ہے کہ وہ طنز و مزاح سے زیادہ قریب رہتے ہیں۔

مصحفی اور انشاء کے زمانے میں اردو شاعری کا مرکز دہلی سے لکھنؤ کو منتقل ہو گیا اور وہاں کے درباری ماحول میں ایسے مضامین کو زیادہ فروغ

حاصل ہوا جو سستی لذت اور انبساط پیدا کرنے والے ہوں۔ اس سے اردو غزل کی علامتوں میں جو اضافے یا ان کے معنی ومفہوم میں تبدیلیاں ہوئیں ان سے ہمارے طنز ومزاح کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ سب سے اہم تبدیلی "ریختی" کا فروغ ہے۔ انشاء اور رنگین دونوں ہی کو ریختی کے ایجاد کا دعویٰ ہے اور بعض حضرات نے اس کا منبع دکن کی سرزمین میں تلاش کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ کچھ حضرات نے اس کے "ہندستانی کیریکٹر" پر اس لحاظ سے زور دیا ہے کہ ہندی شاعری میں اظہار عشق عورت کی طرف سے ہوتا ہے اور مرد کی حیثیت محبوب کی ہوتی ہے۔ لیکن ریختی کو ہندی شاعری سے دور کی مماثلت بھی نہیں ہے۔ ہندی کی عشقیہ شاعری میں عورت کی زبان سے ایسے رکیک اور بے ہودہ مضامین ادا نہیں کراتے جاتے جو ہمیں ریختی میں ملتے ہیں۔ لیکن اس صنف سخن میں "تفریح طبع"، کا سامان ہو یا نہ ہو اس کا بھی ایک افادی پہلو رہا ہے یعنی ریختی کے اشعار میں عورتوں کے سینکڑوں محاورے لباس اور زیورات کے نام اور رسوم ورواج یا ٹونے ٹوٹکے محفوظ ہو گئے ہیں جن کے استعمال کی گنجائش غزل میں مشکل سے نکل سکتی تھی۔

ایک اور صنف جسے طنز ومزاح میں تو کیا رکھا جائے گا لیکن "پھکڑ" یا ہزل نویسی کے ذیل میں آتی ہے وہ شاعری ہے جس میں جنسی اور شہوانی جذبات کو تختۂ مشق بنایا گیا ہے اور ایسی علامتیں اور استعارے برتے گئے ہیں جنھیں ہماری مشرقی تہذیب میں "بدتہذیبی" سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح کی شاعری کے نمونے ابتدا میں جعفر زٹلی کے کلام میں بھی ملتے ہیں اور سودا قائم میر یا میر حسن کا کلیات بھی ان سے خالی نہیں ہے مگر افسق زانی یا چرکین جیسے شعراء نے اسے مستقل موضوع اپنی فکری کاوشوں کا بنایا ہے اور اس کی روایت ہمارے عہد میں عریاں دہلوی یا رفیع احمد خاں لکھنوی تک آتی ہے۔ مگر یہ کلام بلاغت نظام زیادہ تر "سینہ بہ سینہ" ہی چلتا ہے اس لیے اس کے ادبی تاریخ میں

در آنے کا کوئی امکان نہیں۔ اس طرح کے اشعار میں بھی فنکار کی ذہانت کے بڑے اچھے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں اور اس اعتبار سے اردو شاعری عربی فارسی دونوں سے منفرد اور ممتاز ہے۔ جسے ہم عریانی کہتے ہیں وہ عہد جاہلیت کے عربی شعراء کے کلام میں بھی ملتی ہے اور فارسی کے ہجوگو شعراء جیسے عہد اکبری میں ملا شیدا وغیرہ بھی اس حد تک بڑھ جاتے ہیں مگر جتنی داشگاف "گفتگو" "اردو" میں ہو جاتی ہے وہ ان دونوں زبانوں میں ممکن نہیں اس کا اندازہ اس سے کر لیجیے کہ اردو زبان میں گالیوں کا جتنا وافر ذخیرہ ہے اس سے فارسی "محروم" ہے اسی طرح عربی بھی۔

اب ہم اس سرسری جائزے میں عہد غالب کے کنارے تک آگئے ہیں۔ اب تک اردو کا جو کچھ بھی سرمایہ طنز و مزاح ہے وہ نظم کی مختلف اصناف میں ہے اور نثر میں اگر متفرق طور پر کچھ لکھا بھی گیا ہو تو وہ چنداں قابل التفات نہیں ہے۔ مگر مرزا غالب اس لحاظ سے بھی امتیاز رکھتے ہیں کہ ان کے اردو خطوط کے اقتباسات کو ہم اردو نثر میں شگفتہ نگاری اور طنز و مزاح کے ادبی نمونے کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ طنز و مزاح کے بہترین ادبی اظہار کا جو معیار سوچا جا سکتا ہے اس پر غالب کی اردو نثر کے نمونے ہی نہیں ان کے بعض اشعار بھی پورے اترتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں جامعیت برجستگی اور شائستگی ایسے بنیادی اوصاف ہیں جو طنز و مزاح کے لیے بھی ضروری شرائط میں سے ہیں اس لیے غالب کی نثر کو یہ امتیاز ملا ہے کہ وہ بیک وقت بہترین اسلوب کا نمونہ بھی ہے اور بہترین مکتوب نگاری کا بھی۔ اسی طرح اسے نثر میں طنز و مزاح کے نمونے کے طور پر بھی بے تکلف پیش کیا جا سکتا ہے۔

غالب کے بعد سرسید اور ان کے رفقاء نے اردو نثر کی سرپرستی کی اور ان کی تحریروں میں شگفتہ نگاری کے بعض اچھے نمونے ملیں گے

لیکن انھیں طنز و مزاح کی تاریخ سے مربوط کرنا دور از کار بات ہوگی۔ البتہ بعض نثر نگار مثلاً ڈپٹی نذیر احمد کی تحریروں میں طنز و مزاح کا عنصر مل جاتا ہے۔ سرسید کا مقصد اصلاح تھا اور ان کے رفقاء نے بھی یہ کوشش کی کہ طنز و مزاح سے ہٹ کر سنجیدہ نگاری اور علمی اظہار کے لیے اردو اسالیب کی تربیت کریں اس لیے ان کی تحریروں میں وہ شگفتگی نہیں ملے گی جو اسے طنز کا یا مزاح کا شہکار بنا دے۔ البتہ اس زمانے میں جن حضرات نے سرسید تحریک مخالفت پر کمر باندھی تھی ان کی تحریروں میں پھبتی اور پھکڑ اور طنز کا عنصر زیادہ مل سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اودھ پنچ کا دور شروع ہوجاتا ہے۔ اس وقت مغربی تہذیب کا سیل بے اماں امڈا چلا آرہا تھا اودھ پنچ کے فنکاروں نے اس پر بند باندھنے کی کوشش کی اور نظم و نثر میں ایسے لکھنے والوں کا ایک حلقہ پیدا کر دیا جو خالصتہً طنز و مزاح کے نمائندہ تھے ورنہ اس دور سے پہلے ہمیں بعض مزاح گو شعراء تو ملتے ہیں نثر میں خالص مزاح نویس ادیب نہیں تھے۔ دوسرے اودھ پنچ نے اپنے عہد کی سیاست کو ہدف بنایا اس سے عوام میں سیاسی بیداری کا سراغ ملتا ہے۔ ہم انیسویں صدی کی سیاست اور معاشرت کے مسائل کو اردو طنز و مزاح کے اس آئینے میں دیکھ سکتے ہیں جو اودھ پنچ نے پیش کیا تھا اور اس لحاظ سے کسی زمانے کا اردو ادب معاشرتی کیفیات کے اتنے واضح عکس پیش نہیں کرتا۔

اردو طنز و مزاح کی کوئی تاریخ لکھی جائے۔ خواہ وہ مختصر ہو یا طویل اس میں اودھ پنچ کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا اجراء ۱۸۷۷ء میں ہوا اور یہ ۱۹۱۲ء تک جاری رہا۔ اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے جنھوں نے غدر سے ایک سال پہلے آنکھ کھولی تھی اور ۲۲ فروری ۱۹۱۵ء کو انتقال کر گئے۔ گویا انھوں نے جتنی زندگی پائی وہ حکومت برطانیہ کے استحکام اور ہندوستانی

تمدن کے مغربی اثرات سے مغلوب ہونے کے عمل کا مشاہدہ کرنے میں گزری۔ رہنے والے وہ اودھ کے تھے اس لیے انھیں لامحالہ انگریزوں اور انگریزی تہذیب سے ایک طرح کی کد ہونی ہی چاہیے تھی کیونکہ انگریزوں نے جس طرح ملک اودھ پر غاصبانہ قبضہ کیا تھا اسے وہاں کے باشندے آسانی سے فراموش کرنے والے نہیں تھے۔

اودھ پنچ نے اپنے عروج کے زمانے میں ایسے لکھنے والے پیدا کر دیے تھے جن کو غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور ان لکھنے والوں کی طنزیہ و مزاحیہ تحریروں نے اودھ پنچ کو ایک تحریک بنا دیا۔ اس کا ثبوت وہ اخبارات ہیں جو ہندستان کے کونے کونے سے نکلنے شروع ہو گئے تھے جیسے پنجاب پنچ۔ لاہور پنچ۔ جالندھر پنچ۔ آگرہ پنچ۔ دکن پنچ وغیرہ۔ اور اودھ پنچ کے لکھنے والوں میں ایسے نام سامنے آئے جو خود طنز و مزاح کی تاریخ کا مستقل باب ہیں جیسے اکبرالہ آبادی۔ رتن ناتھ سرشار۔ تربھون ناتھ ہجر۔ سید محمد آزاد۔ مچھو بیگ ستم ظریف۔ احمد علی کسمنڈوی۔ احمد علی شوق۔ محفوظ علی بدایونی۔ جوالا پرشاد برق وغیرہ۔

اودھ پنچ کی خصوصیات میں یہ بھی ہے کہ اس نے اردو صحافت میں بعض نئی باتوں کو روشناس کرایا۔ مثلاً اس سے پہلے کارٹون چھاپنے کا رواج نہیں تھا۔ اودھ پنچ کے کارٹون سیاسی مسائل پر بھی ہوتے تھے۔ دوسرے بعض پرانی چیزوں کو اس اخبار میں نئے انداز سے پیش کیا گیا جیسے "الف نامہ" جو ملّا دوپیازہ سے بھی منسوب ہے اور ایسی ہی ایک تحریر کلیات جعفر زٹلی میں بھی ملتی ہے۔ اس میں معروف الفاظ یا اصطلاحات کے آغاز میں الف لام اضافہ کر کے اُن کے نئے اور مزاحیہ انداز کے معنی لکھے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو کہاوت کا درجہ اختیار کر گئے ہیں جیسے "الفیل۔ اوّلِ مشق یزداں"، "الفربہ۔ خواہ مخواہ مرد معقول"، وغیرہ۔ اودھ پنچ نے

ایسے الفاظ مثلاً "پالیسی" سویلزیشن "پارلیمنٹ" وغیرہ کی ایسی ہی مزاحیہ تشریحات کرکے درپردہ انگریزوں کی حکومت اور پالیسی اور مغربی تہذیب پر کاری چوٹیں لگائی ہیں۔

اودھ پنچ کی شہرت ان ادبی ہنگامہ آرائیوں کی وجہ سے بھی ہوئی جو اس نے اپنے زمانے کے مشہور لکھنے والوں کے مقابلے میں شروع کی تھیں۔ اس کا پہلا ہدف تو مولانا الطاف حسین حالی تھے جنھوں نے "مقدمہ شعروشاعری" لکھ کر لکھنؤ اسکول کے حامیوں کو برہم کر دیا تھا اودھ پنچ نے ایک عرصہ تک حالی کو اپنے تمسخر اور استہزا کا نشانہ بنائے رکھا۔ مگر مولانا حالی نیک نفس اور مرنجاں مرنج انسان تھے انھوں نے تمام وار سہہ لیے۔ اگر وہ بھی اپنے شاگردوں اور حامیوں کی ٹولی کو ساتھ لے کر میدان کارزار میں اتر پڑتے تو ادبی تاریخوں میں "پانی پت کی چوتھی لڑائی" کا حال بھی لکھا جاتا۔ دوسرا ادبی معرکہ چکبست و شرر کے مابین "مثنوی گلزار نسیم" پر ہوا اور یہ اس لیے طول پکڑ گیا کہ فریقین میں سے کوئی بھی نچلا بیٹھنے کو آمادہ نہ تھا۔ اس معرکہ کی کارروائی کتابی صورت میں بھی چھپ چکی ہے۔

اودھ پنچ نے جس انداز کی مزاحیہ صحافت اردو میں رائج کی وہ یوں بھی قابل قدر ہے کہ اس سے پہلے اس انداز کا اور کوئی نمونہ اردو میں موجود نہیں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کی ظرافت کا معیار کچھ بہت اعلیٰ نہیں تھا اور کہیں کہیں پھکڑ بھی طبع سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ اس کا خاص انداز پھبتی، ضلع جگت اور طنز و تعریض کا ہے وہ شائستگی اور انبساط ساماں نایاب ہے جس کی ہم اعلیٰ درجے کے مزاحیہ ادب سے توقع کرتے ہیں مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اس دور کے حالات اسی طرح کے معیار و مذاق کا مطالبہ کر رہے تھے۔ ہاں یہ شکوہ ضرور کیا جاسکتا

ہے کہ اس کا اثر لکھنؤ کے اسلوب پر بہت زمانے تک رہا اور کسی حد تک آج بھی موجود ہے۔

کچھ نقادوں نے "اودھ پنچ" کا موازنہ انگریزی کے مشہور اخبار (London Punch) سے کیا ہے یہ بے تکلف ممکن ہو سکتا ہے اس لیے کہ اودھ پنچ اور (London Punch) کے ماحول اور سیاسی و سماجی حالات میں بھی فرق تھا اور دونوں کے قاریوں کی سطح ادراک اور سماجی شعور میں بھی۔ البتہ اودھ پنچ کا ایک کارنامہ اسے اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں زندہ رکھے گا کہ اس نے ایک تہذیبی بحران کے زمانے میں لوگوں کو ہنسایا اور لکھنے والوں کی ایک پوری جماعت ایسی تیار کر دی جس کا اثر اردو نثر کے اسالیب پر آج تک باقی ہے ان لکھنے والوں میں اکبر الہ آبادی نظم میں اور رتن ناتھ سرشار نثر میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

اکبر الہ آبادی طنز و مزاح میں اپنا منفرد اسلوب رکھتے ہیں اور ان کی تقلید ابھی تک کسی سے ممکن نہیں ہو سکی۔ انھوں نے مشرقی تہذیب کی برتری اور مغربی تمدن کی اس روش پر تنقید کو اپنا موضوع بنایا جو ہم مشرقیوں کے مزاج سے لگاؤ نہیں کھاتی۔ اکبر کے عہد میں مغربی تعلیم و تہذیب کا سکہ پوری طرح رائج ہو چکا تھا اور مشرقی تصورات کی حرمت و اہمیت کم ہو رہی تھی انھوں نے مغرب کو اپنے مطاعن کا ہدف بنا کر تمام مشرق کی طرف سے کفارہ ادا کر دیا۔ اس سے بحث نہیں کہ اکبر کے تصورات صحیح تھے یا نہیں، لیکن اپنی روایات کو خود اپنے پاؤں سے ٹھکرا دینا اور کسی غیر ملکی تہذیب کے تسلط کو بغیر احتجاج کے قبول کر لینا بھی کوئی غیرت کا ثبوت نہ ہوتا اس لیے اکبر نے اس زمانے میں جو کچھ لکھا وہ انھیں لکھنا ہی چاہیے تھا۔

رتن ناتھ سرشار کی تمام شہرت اب ان کے کلاسیکی شاہکار

"فسانۂ آزاد" کی وجہ سے ہے۔ اس میں انھوں نے لکھنؤ کے تمدن کی عکاسی بہت خوب صورتی اور جزرسی کے ساتھ کی ہے۔ فسانۂ آزاد کا بغور مطالعہ کرنے والا اس عہد کے تمدن کی جھلکیاں فسانۂ آزاد میں جتنی واضح دیکھے گا اتنی اسے کسی تاریخ کی کتاب میں نہیں ملیں گی۔ سرشار کا اسلوب ادبیت سے خالی نہیں اور اس میں لکھنؤ اسکول کی تمام خصوصیات بیک وقت مل جاتی ہیں پھر بھی "فسانۂ آزاد" کا عیب اس کی طوالت ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو "خوجی" کا زندۂ جاوید کردار بھی دیا ہے لیکن اسی طوالت کی وجہ سے یہ عیب پیدا ہوگیا ہے کہ کچھ حوادث اور بوالعجبیاں تو خوجی سے سرزد ہوتی ہیں مگر اکثر مواقع پر حوادث کا فریم تیار کرکے اس میں خوجی کو فٹ کیا گیا ہے۔ اور یہ حال اردو کے دوسرے مستقل کرداروں کا بھی ہے۔ اسی طرح کا ایک کردار منشی سجاد حسین کے "حاجی بلغ العلی" بھی ہیں۔ بعد کے دور میں علی عباس حسینی کے حکیم یا نا امتیاز علی تاج کے چچا چھکن اور شوکت تھانوی کے قاضی جی کا نام لیا جا سکتا ہے۔

اودھ پنچ کے کچھ لکھنے والے تو معروف ہیں اور ان کے مضامین یا نظمیں علیحدہ بھی کتابی صورت میں چھپ چکی ہیں مگر بہت سے وہ اہل قلم بھی اودھ پنچ میں لکھتے رہے جو بہت بعد کو اپنی اصلی شکل وصورت میں سامنے آئے مثلاً مولوی محفوظ علی بدایونی نے کبھی اپنے نام سے نہیں لکھا۔ اسی طرح خود منشی سجاد حسین کبھی فرضی ناموں سے لکھا کرتے تھے۔ ایک گروہ "اودھ پنچی فنکاروں" کا ایسا بھی ہے جو ابھی تک پردۂ خفا میں ہے۔ اودھ پنچ کا پرانا فائل دیکھنے والے کو بہت سا کلام نظم ونثر "لافر" یا "مولانا دکنی" یا مولانا جنوبی یا مس پشتیہ یا مس سہر ردیہ یا ایسے ہی دوسرے فرضی ناموں سے ملے گا۔ ان مضامین کے اصل مصنف نے کبھی اپنے چہرے سے نقاب نہیں اٹھایا۔ یہ مولوی عبدالغفور شہباز کے شاگرد سید فضل ستار

نقوی کا کلام ہے جو لا ابالی تخلص کرتے تھے اور مختلف فرضی ناموں سے اودھ پنچ میں لکھا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک بار وہ لکھنؤ گئے اور منشی سجاد حسین سے ملے انھوں نے اثنائے کلام میں "مسٹر لافر" اور مسٹر لاابالی وغیرہ کی ان تخلیقات کو سراہا جو اودھ پنچ میں چھپتی رہتی تھیں تب بھی انھوں نے ظاہر نہ کیا کہ وہ ذات شریف یہ خود ہی ہیں۔ ان کے کلام نثر و نظم کا ایک انتخاب اشاعت کے لیے تیار ہو رہا ہے۔

اودھ پنچ کا دور اول تو ۱۹۱۲ء میں ختم ہو گیا تھا بعد کو اسے شیخ ممتاز حسین نے اسی نام سے پھر جاری کیا مگر وہ اہمیت اور خصوصیت جو دور اول کے اودھ پنچ کو حاصل تھی اسے نصیب نہیں ہوئی کیونکہ لکھنے والوں کی اہمیت کے ماسوا اس صدی کے ابتدائی سیاسی و معاشرتی حالات کا واپس آنا بھی محال تھا اور اودھ پنچ کی خدمات اسی وقت روشن ہوتی ہیں جب انھیں سیاسی و سماجی حالات کے سیاق و سباق میں دیکھا جائے۔

اودھ پنچ کے دور کے خاتمہ پر عہد جدید کا آغاز ہوتا ہے اور اس وقت ہمیں مہدی افادی۔ سلطان حیدر جوش۔ سجاد حیدر یلدرم۔ منشی پریم چند۔ علی عباس حسینی۔ قاضی عبدالغفار۔ ملا رموزی۔ خواجہ حسن نظامی۔ ظفر علی خاں۔ عبدالماجد دریابادی۔ امتیاز علی تاج۔ عظیم بیگ چغتائی۔ فرحت اللہ بیگ اور عبدالمجید سالک جیسے لکھنے والے ملتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر وہ ہیں جو مغربی ادب سے بھی شناسائی رکھتے تھے اس لیے ان کی تخلیقات میں نیا رنگ و آہنگ موجود ہے۔ ان میں بیشتر وہ لکھنے والے ہیں جو بنیادی طور پر مزاح نگار نہیں ہیں بلکہ ان کی تحریروں میں "شگفتہ نگاری" کے نمونے ملتے ہیں۔ وہ لکھنے والے جنھوں نے طنز و مزاح ہی سے سروکار رکھا ظفر علی خاں، ملا رموزی، عظیم بیگ اور فرحت اللہ بیگ ہیں۔ ان حضرات کے معاً بعد جو دور آتا ہے اس میں سر فہرست نام رشید احمد صدیقی کا ہے

پھر آوارہ، پطرس بخاری، کنہیا لال کپور، کرشن چندر، شوکت تھانوی، شفیق الرحمٰن ابراہیم جلیس، نکر تونسوی، غلام احمد فرقت۔ احمد جمال پاشا، مشتاق احمد یوسفی۔ ابن انشاء، مجتبیٰ حسین وغیرہ۔ ادھر نظم کے میدان میں اودھ پنچ کے بعد ریاض خیرآبادی کا فتنہ و عطر فتنہ ہے۔ اور عہد جدید کے آغاز میں ظریف لکھنوی، احمق پھپھوندوی، جوش ملیح آبادی، شاد عارفی، سید محمد جعفری، سید ضمیر جعفری، مجید لاہوری، واہی نقوی، راجا مہدی علیخاں، دلاور فگار، رئیس امروہوی اور شہباز امروہوی، سرور ڈنڈا اور سلیمان خطیب کا نام لیا جا سکتا ہے۔

اس جائزے میں طنز و مزاح کی تاریخ کا استقصا، یا انتقادی مطالعہ ممکن نہیں۔ نہ یہ مناسب ہوگا کہ عمومی طور پر ریمارک دے دیے جائیں اس لیے عہد جدید تک بنیادی رجحانات کا ایک جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہاں سے ہم اردو ادب میں طنز و مزاح کے تمام سرمائے کو اور اس کے ادبی اسالیب کے ارتقاء کو ذہن میں رکھ کر اس کا تجزیہ موضوع اور معیار کے اعتبار سے کریں گے۔ یعنی ایک تو اس کی مختلف اصناف اور ہیئتیں جو اس تمام ارتقاء کے دوران سامنے آئیں دوسرے اس کے موضوع اور ان دونوں کے مجموعی تعلق سے اسالیب۔

یہاں ایک نکتے کی وضاحت کر دینا بہت ضروری ہے۔ اگرچہ یہ وضاحت بالکل آغاز میں ہی ہونی چاہیے تھی۔ طنز اور مزاح کے الفاظ عموماً ساتھ ساتھ استعمال ہوتے ہیں لیکن ان دونوں کے مفہوم و مقصود اور اظہار و اسلوب میں گہرا فرق ہے۔ یہ قطعاً ممکن ہے کہ کسی ادب پارے میں طنز ہو مزاح نہ ہو یا بالعکس۔ اور دونوں صفات کا اجتماع بھی ممکن ہے۔ ہمارے بہت سے ادیب یا شاعر ایسے ہیں جنھیں یا تو مزاح نگار کہا جا سکتا ہے یا طنز نگار۔ ایسا بہت کم ہوگا کہ ایک ہی شخصیت ان دونوں کی جامع ہو۔ پھر طنز و مزاح کی قسمیں بھی بے شمار

ہیں۔ طنز، تعریض، ہجو، تنقیص، تمسخر، استہزا، پھکڑ، پھبتی، شوخی، شگفتگی، ظرافت، تضحیک ان سب لفظوں کے علاحدہ علاحدہ معنوی فرق (SHADES) ہیں اور ان میں ایک طرف اعلیٰ درجے کی ذہانت، برجستگی اور نکتہ رسی کے مظاہر ملیں گے جنھیں بہترین تہذیبی شعور سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے دوسری طرف پست اندیشی، سستی لذت، سوقیانہ اور مبتذل فقرے کے جلوے بھی نظر آئیں گے جنھیں کچھ بھی کہا جائے "ادب" کہنا مشکل ہوگا۔ ہم نے ایسے نازک فرق کو ذہن میں رکھا ہے مگر یہاں اس کی تفصیل یا تحلیل کو ضروری نہیں سمجھا۔ دوسری بات یہ ملحوظ رہے کہ جتنے بھی مجرد تصورات ہیں یا فنونِ لطیفہ کے مظاہر ہیں ان کی قطعی اور حتمی تعریف ممکن نہیں ہوتی۔ مثلاً یہ بتانا آسان نہیں ہے کہ شعر کیا ہوتا ہے اسلوب کسے کہتے ہیں قنوطیت کیا ہے یا طنز اور مزاح میں کیا فرق ہے۔ ہم زیادہ سے زیادہ اس کی کچھ وضاحت کر سکتے ہیں یا یہ بتا سکتے ہیں کہ انھیں کیا سمجھا گیا ہے لیکن نظری سطح پر ایسی "تعریف" کردینا جس سے علمی تنقید یا منطقی نتائج کا استنباط ریاضی کے کلیوں کی طرح میکانکی ہو جائے ممکن نہیں لہٰذا ہم نے بھی اپنی گفتگو کو اس مفروضہ کے ساتھ شروع کیا ہے کہ اردو میں طنز یا مزاح کا وہی مفہوم سمجھا جاتا ہے جو ہونا چاہیے۔ اردو میں طنز و ظرافت کے اولین نمونے نظم میں ملتے ہیں اُن میں ہجو، ہزل، تحریف سے زیادہ تر رنگِ مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ شہر آشوب مزاح سے زیادہ سماجی عوامل پر طنز کا نمونہ پیش کرتے ہیں اور ان میں مزاحیہ شاعری کی نسبت سے تہذیبی اور معاشرتی شعور کی بھی فراوانی ہے ریختی کو ہم ہزل ہی کی ایک شاخ سمجھ سکتے ہیں۔

نثر میں کردار نگاری اور خاکہ نگاری کے ابتدائی نمونے طنز و مزاح کی مثال ہیں مگر اودھ پنچ کے زمانے سے سیاسی اور سماجی اور تہذیبی

مسائل کو طنز و مزاح کا موضوع بنایا گیا اور زمانہ مابعد میں جو نثری نمونے طنز و مزاح کے ملتے ہیں ان کا آب و رنگ سیاست کی نیرنگیوں ہی کا مرہون منّت ہے۔

بیسویں صدی کے بعد ایک اور روایت اخبارات میں "مزاحیہ کالم" لکھنے کی شروع ہوئی ہے۔ غالباً مولانا محمد علی جوہر کے ہمدرد میں پہلی بار مزاحیہ کالم کا سلسلہ شروع ہوا۔ مولانا عبدالمجید سالک (انقلاب)، مولانا عبدالماجد دریا بادی (سچ اور صدق) چراغ حسن حسرت (شیرازہ اور امروز)، مجید لاہوری (نمک دان) اور فکر تونسوی (ملاپ)، اپنے طنزیہ و مزاحیہ کالم کے لیے عام طور پر متعارف ہیں۔ لیکن اخباری مضامین کے ادبی معیار کا ایک سطح پر قائم رکھنا مشکل ہی ہوتا ہے اور اخبار کی زندگی بھی ایک دو دن سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ان کالموں کا اگر انتخاب کیا جائے تو یقیناً ان میں بعض جواہر پارے بھی بکھرے ہوئے ملیں گے۔

اسی صدی میں ایک روایت بعض اخباروں نے کسی موضوع پہ ایک مزاحیہ قطعہ چھاپنے کی بھی قائم کی ہے۔ چنانچہ اخبار جنگ میں رئیس امروہوی تقریباً ۲۷ سال سے روزانہ ایک مزاحیہ قطعہ لکھ رہے ہیں۔ اور اب انھوں نے پچھلے پچیس سال کے قطعات پر مشتمل ایک مجموعہ دو جلدوں میں چھاپا ہے جس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس چوتھائی صدی کا کوئی اہم تاریخی یا سیاسی واقعہ ان کی نشتر زنی سے بچ نہیں سکا ہے۔

مزاحیہ ناولوں کا سلسلہ بھی اسی دور کی پیداوار ہے۔ ابتدائی ناول معاشرتی اصلاح ہی کے مقصد سے لکھے گئے اور تفریح کے لیے داستانیں تھیں مگر ان میں بعض ایسے بوالعجب کردار پیش کیے گئے ہیں جو کچھ دیر کے لیے قاری کی توجہ اپنی طرف کھینچتے ہیں اور اسے قصے کی طوالت کو انگیز کرنے کا حوصلہ بخش دیتے ہیں۔ لیکن دور حاضر کے مزاحیہ ناولوں میں واقعات

سے مزاح کم اور کرداروں کی بوالعجبیوں سے ہی زیادہ پیش کیا گیا ہے۔

ایک بات خاص طور پر حیرت انگیز ہے کہ اس دور میں طنز و مزاح کے موضوعات میں وسعت اور تنوع نہیں ملتا۔ کوئی سیاسی ناانصافی یا بدعنوانی ہی اس کا بہترین ہدف نہیں ہوسکتی۔ اس زمانے میں اخلاقی اور معاشرتی سطح پر جو بے یقینی اور تشکیک کا غلبہ ہے یا تصورات کی باہم آویزش ہے اس کا عکس ہمارے مزاح نگاروں کی تحریروں میں کم ہی ملتا ہے شاید یہ سبب ہو کہ طنز و مزاح کو عام سماجی بیماریوں کا علاج نہیں بلکہ محض تفریح طبع کا آلہ سمجھ لیا گیا ہے۔

اسلوب ادا کے اعتبار سے بھی جدید دور کا طنزیہ و مزاحیہ ادب اس برجستگی اور شائستگی کے معیار کو برقرار نہیں رکھ سکا ہے جو رشید احمد صدیقی پطرس بخاری اور کنہیا لال کپور نے قائم کر دیا تھا۔ (۱۹۷۴ء)

مثنویاتِ قائم چاندپوری

قائم چاندپوری کے دیوان میں تقریباً پندرہ مثنویاں ہیں۔ نسخۂ رام پور میں قائم کی جو مثنویات ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔ اس فہرس میں ہجویہ مثنویوں اور اخلاقی حکایتوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ اس طرح ان کی مجموعی تعداد ۲۷ ہو جاتی ہے۔ یہ اعداد و شمار رسالہ معارف جلد ۹۶ شمارہ ۴ سے لیے گئے ہیں:

(۱) مثنوی شدّتِ سرما، ۵۶ شعر (۲) مثنوی عشق درویش، ۱۴۳ شعر (۳) مثنوی رمز الصلوٰۃ، ۱۶۹ شعر (۴) مثنوی قضا و قدر، ۶۸ شعر (۵) مثنوی درد قولنج، ۲۲ شعر (۶) مثنوی مرد عیّار، ۸ شعر (۷) مثنوی بندۂ درگاہ، ۷ شعر (۸) مثنوی سکندر و ارسطو، ۱۳ شعر (۹) مثنوی در صفت ہولی، ۵۴ شعر (۱۰) مثنوی زنِ اوباش، ۴ شعر (۱۱) مثنوی گرگ و گوسفند، ۱۶ شعر (۱۲) شاخ تراشی دکنذا، ۱۵ شعر (۱۳) مردِ طریق، ۱ شعر (۱۴) ہوس، ۱۲ شعر (۱۵) زنِ سبو بردار، ۲ شعر (۱۶) مردِ عارف، ۴ شعر (۱۷) پدر و پسر، ۱۰ شعر (۱۸) دو دوست، ۱۵ شعر (۱۹) اُستاد، ۱۴ شعر (۲۰) مردِ عالی مقام، ۷ شعر (۲۱) ہجوِ حافظ نابینا، ۴۴ شعر (۲۲) ہجو خارش، ۱۰ شعر (۲۳) ہجو گوزی، ۲ شعر (۲۴) ہجو حجام، ۲۵ شعر (۲۵) ہجو کیچڑ بلبولی، ۳۶ شعر (۲۶) ہجو پتنگ باز، ۵۵ شعر (۲۷) ہجو شیخ، ۴ شعر۔

ان میں دو مثنویاں تو بہت طویل ہیں یعنی "قصۂ عشق درویش"[1] جس میں ۴۴۳ اشعار ہیں۔ بعض روایتوں میں اشعار کی تعداد ۳۵۹ یا کم و بیش بھی ہے نسخہ رام پور میں ۳۶۱ اشعار ہیں۔ دوسری مثنوی "حیرت افزا" جو ۴۸۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ دوسری مثنویوں کی فہرس یہ ہے:-

(۱) مثنوی در ہجو کاذب۔ اس میں ۵۷ اشعار ہیں۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

آہ کیا ہو گئے وہ لیل و نہار
کہ کہہ و مہ کو جھوٹ سے تھا عار

(۲) مثنوی در ہجو طفلِ تپنگ باز۔ اس میں ۵۵ اشعار ہیں[2] اور ابتدا یوں ہوتی ہے:-

ایک لونڈا تپنگ کا ہی کھلاڑ — دور میں اس کے ... ہے ہزار

یہ مثنوی فحش ہے۔

(۳) مثنوی در ہجو[3] ...... یہ بھی فحش ہے اور کسی معروف شخص کی ہجو میں ہے۔ مجمع الانتخاب میں عنوان "درمذمت گوزی" ہے اس میں ۴۴ اشعار ہیں۔ نسخہ رام پور میں ۲۷ شعر ہیں۔ ابتدا یوں ہوتی ہے:

یاں جو کوئی غنی ہے یا محتاج — چاہیے یہ کہ جانے قدرِ اناج

(۴) مثنوی در ہجو حجّام۔ اس میں ۵۳ اشعار ہیں[4] اور قائم نے کسی موترا ش

---

[1] اس میں پنجاب کے ایک درویش کی داستان معاشقہ نظم کی گئی ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے رسالہ سب رس (فروری ۱۹۷۰ء) میں ملاحظہ ہو۔ راقم الحروف کا مضمون بعنوان "قائم کی عشقیہ مثنوی"۔ (کلیاتِ سودا، طبع نولکشور ۱۸۸۷ء صفحات ۲۱۵ تا ۲۲۶)

[2] مجمع الانتخاب (قلمی) میں تعداد اشعار ۵۲ ہے۔

[3] مجمع الانتخاب میں ۴۳ اشعار ہیں [4] نسخہ رامپور میں ۵۴ شعر ہیں۔

کی ہجو میں لکھی ہے۔ ابتدا یوں ہے :۔

اب جو حجام اپنے ساتھ ہے یاں — سو وہ بھڑوا، پلشت گندہ وہاں

(۵) مثنوی در ہجو خارش۔ کھجلی کی ہجو میں ۳۶[1] شعروں کی یہ مثنوی یوں شروع ہوتی ہے:

خارش کی ہے اس ہوا میں یہ دھوم — چُوتا ہے ہر اک بہ شکلِ مجذوم

(۶) مثنوی در ہجو کیچڑ بسولی۔ قصبہ بسولی میں برسات کی وجہ سے راستوں کی جو حالت ہو جاتی تھی اس کا نقشہ کھینچا ہے۔ مثنوی میں ۳۵[2]، اشعار ہیں۔

اے خامہ یہ کہہ تری ہے کیا فکر — کیچڑ کا بسولی کی ہے یاں ذکر

(۷) مثنوی در ہجو شدّتِ سردی۔ یہ مثنوی بھی غلطی سے سوداؔ کی طرف منسوب ہوتی رہی ہے[3] مگر اصل میں قائمؔ کی تصنیف ہے اس میں ۵۸[4]، اشعار ہیں۔ ابتدا یہ ہے :

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید — صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

(۸) مثنوی در ہجو اکول۔ ۴۸، اشعار کی یہ مثنوی کسی حافظ کی قدح میں ہے جو کھانے کا بہت شوقین تھا۔ نسخہ رام پور میں ۴۴ شعر ہیں اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :۔

ایک حافظ ہم سے آشنا ہے — کھانے کا وہ جی سے مبتلا ہے

---

[1] مجمع الانتخاب میں ۵۳ شعر ہیں نسخہ رام پور میں اس کے صرف ۱۰ شعر دیے ہیں

[2] نسخہ رام پور میں ۳۶، اشعار ہیں۔ [3] کلیاتِ سوداؔ، طبع نولکشور ۱۸۸۷ء ص ۱۸۸ تا ۱۹۰۔ [4] نسخہ رام پور میں ۵۶، اشعار [نسخہ رام پور کے اشعار کی تعداد میں نے اپنی تحریری یادداشت کے علاوہ رسالہ معارف اعظم گڑھ جلد ۶۹ شمارہ ۴ تا ۶ مطابق اپریل تا جون ۱۹۵۲ء سے بھی حاصل کی ہیں۔ معارف کے مذکورہ شماروں میں جناب محمد علی خاں اثر رام پوری کا مضمون بہ عنوان "قائمؔ چاند پوری اور ان کا کلام" شائع ہوا تھا]

(۹) مثنوی در صفت ہولی۔ اس میں ۵۴[1] اشعار ہیں اور ہولی کا منظر بہت ہی اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ موضوع کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس مثنوی کے کچھ منتخب اشعار یہاں درج کر دیے جائیں:

دلا آج سچ کہہ تو کیا ہے سبب — کہ جوں غنچہ ہر دل ہے محو طرب
نہ گل ایک پھولا سماتا نہیں — بہم لب کلی کا بھی آتا نہیں
ابھرتا ہے مستی سے مے کا حباب — ہے بالیدہ شادی سے موج شراب
نہیں آج حالت سے مستی کی دور — کہ جوں غنچہ اُبلے دلوں سے سرور
ہے لبریز مستی چمن یاں تلک — کہ نرگس کی گردن گئی ہے ڈھلک
ہزارا لیے جام ہے انتظار — کھڑا ہے رکھے سر پہ خم کو کنار
کہ گر محتسب کا ہو ادھر مرور — پلا دیں اسے یک دو ساغر بزور
اترنے کا ہے کیف، لالہ کو بیم — مئے سرخ میں گھولتا ہے افیم
جہاں ہاتھ میں گل کے دیکھا ہے جام — طلب میں پسارا ہے غنچے نے کام
زبس اہلِ عالم ہیں محوِ شراب — ہے ممنوع اس دور میں حرفِ آب
نہ جوں شیشہ اک تن کو دیکھے گا تو — کہ ہووے وہ مے سے نہ تر تا گلو
ہے مستی سے یہ حال عالم تباہ — کہ ملّا نے گم کی ہے مسجد کی راہ
جو مصلّہ کہ زاہد کے یاں خاص ہو — ہے دکانِ خمار میں رہنِ مے
جواب دَیر کی راہ سے آتے ہے — دبے پاؤں قاضی نکل جاتے ہے
بہم رند و زاہد مے آشام ہیں — مگر یہ کہ ہولی کے ایام ہیں
خوشا موسمِ عیش و عہدِ نشاط — کہ عالم کو ہے یاں تلک انبساط
جو بڑھیا غمِ قوت سے تھی خرف — بجاتی ہے دن رات چلنی سے دف
ہے کیا ان دنوں تنگدستی سے مار — اک عالم کا ہے فاقہ مستی شعار

---

[1] نسخہ رام پور میں تعداد اشعار ۴۴۔

اگر حال دریا پہ کیجیے قیاس
عجب کچھ ہے واں کے اجزا کا حال

کھلا رہ گیا ہے دہانِ صدف
لبِ جُو سے جاری ہیں مستی میں کف

جو تر کر کے بھاگے اسے موجِ آب
ہے تیچھے لیے قمقمے کو حباب

یہ غالب ہے گرداب پر وجد و حال
کہ جز رقص بھولا ہے سیدھی وہ چال

عجب کیا جو یہ حالتیں ہوں پدید
نہیں عالمِ آب سے کچھ بعید

دفوں کا زبس شور ہے ہر طرف
ہر اک کان باجے ہے مانندِ دف

نہ تنہا زمیں کو ہی زلزال ہے
یہی آسماں کا بھی احوال ہے

ستاروں نے ہر سمت کھینچی ہے صف
بغل میں لیے ماہ پھرتا ہے دف

نہ اک زہرہ ہے محوِ خنیاگری
بجاتا ہے مریخ بھی خنجری

ہے خوشے سے پروین کے روشن یہ بات
کہ اکٹھا ہوا چونپ کا یہ سات

جہاں گھر سے باہر ہو مہرِ منیر
ملے صبح چہرے کو اس کے عبیر

جسے چرخ و انجم کہیں ہیں عوام
ہے اک خوان پُر قمقموں سے تمام

ہر اک سمت عالم میں ہے شور و شر
ہے ہر باخبر آپ سے بے خبر

نہ واعظ کو مسجد کے منبر سے کام
نہ مسجد میں اب مقتدی نے امام

ہے کتوالِ شہر اس قدر بے وقار
کہ نت اس پہ بھٹیاریوں کی ہے مار

زبس ہر گلی میں ہے لڑکوں کا شور
ہے کیچڑ میں ہر راہ رَو شور بور

جو با آبرو یاں ہے دولا بے ار
نت اس کے گلے میں ہے جوتی کا ہار

لیے ہاتھ پچکاریں خوب رُو
رکھیں ہیں ہر اک سمت چنا ریں غلو

کسی پر کوئی چھپ کے پھینکے ہے رنگ
کوئی قمقموں سے ہے سرگرم جنگ

کسی نے لگائی ہے کونے میں گھات
کہ بازی میں خلوت کی ہے لاکھ بات

نگاہیں کسو کی ہیں یاں حرف جوش
ہے ابرو سے کوئی اشارت فروش

کسی کا کوئی کھولتا ہے نقاب
کوئی محوِ بازی میں ہے بے حجاب

ہے ڈوبا کوئی رنگ میں سر بسر
فقط آب میں ہے کوئی تر بتر

زلبس رنگ کی ہر طرف مار ہے — جہاں ایک قلم زعفران زار ہے
دعا پر کر اب قصہ قائم یہ حرف — کہ طولِ سخن تجھ سے ہے بس شگرف
الٰہی ہے جب تک کہ یہ شور و شر — ہو عالم میں ہولی سے باقی اثر
کنور کے سبب چاند پور میں مدام
رہے برج سے چوگنی دھوم دھام

(۱۰) مثنوی درویش۔ اس مثنوی میں ۶۹، اشعار ہیں نسخہ رام پور میں ایک شعر کم ہے۔ اس میں دکن کے ایک حجام کی کہانی بیان کی گئی ہے جس کے گھر میں گھس کر ایک بھیڑیے نے بچوں کو کھا لیا تھا۔ اس غم میں حجام نے کنوئیں میں ڈوب کر خودکشی کر لی اور آخرکار اس کی بیوی نے چھری سے اپنے تئیں ہلاک کر لیا۔ ابتدا اس طرح ہوتی ہے:۔

رات ایک فقیر بے سر و پا — کہتا تھا یہ حال عبرت افزا

(۱۱) مثنوی قصہ بنگ خور۔ یہ ۱۴ شعروں کی مختصر سی مثنوی ہے جس میں ایک بنگ نوش کا قصہ بیان کیا ہے:۔

تھے اک بنگی لیکن نوآموز سے — کچھ افراط اُنھوں نے کی ہر روز سے

(۱۲) مثنوی رمز الصلوٰۃ۔ یہ ۲۵۲، اشعار کی مثنوی ہے[1]۔ اس میں نماز کے اوصاف اور فوائد بیان کیے ہیں۔ درمیان میں بعض تمثیلی قصے بھی آ گئے ہیں انہی میں پورب کے ایک جوان اور ایک حسینہ کے عشق کا قصہ بھی بیان کیا ہے کہ وہ حسینہ خود کنیز کا بھیس بدل کر اس کے پاس گئی اور اس سے اختلاط کیا پھر اسے مغالطے میں رکھا کہ ہماری بی بی سے نکل آ کر ملو جب یہ پہنچے تو اس نے بھانڈا پھوڑ دیا کہ تمھیں مجھ سے عشق صادق نہیں بوالہوسی ہے، وغیرہ۔ یہ مثنوی اس شعر سے شروع ہوتی ہے:۔

---

[1] نسخہ رام پور میں ۲۷۰ اشعر ہیں۔

بنامِ طرازندۂ جسم و جاں — کہ رکھتا ہے ہر تن میں حکم رواں

(۱۳) مثنوی در حکایت[1]۔ یہ ۳۴ شعروں کی ایک مختصر مثنوی ہے جس میں ایک تمثیل بیان کی گئی ہے۔ آغاز یوں ہوتا ہے:-

عجم کے زمانے کا تاریخ داں — یہ لکھتا ہے احوال وارفتگاں

(۱۴) مثنوی قصّۂ عشقِ درویش۔ یہ مثنوی ۱۶۱ اشعار پر مشتمل ہے اور غلطی سے کلیاتِ سودا میں بھی شامل ہو گئی ہے۔ اس میں پنجاب کے ایک درویش شاہ لدھا کی داستانِ معاشقہ ہے۔ یہ قصہ سب سے پہلے اورنگ زیب کے ابتدائی دور میں کسی شاعر نے فارسی زبان میں لکھا تھا بعد کو قائم چاندپوری، مرزا علی لطف اور راسخ عظیم آبادی نے بھی اسے نظم کیا۔ آغاز کا شعر یہ ہے:

الٰہی شعلہ زن کر آتشِ دل — تب دل دے بقدرِ خواہشِ دل
وہ دل دے ہو جو نیشِ غم سے معمور — مشبّک سر بسر جوں خانۂ زنبور

یعنی پہلے تو بارہ شعروں میں عشق کی تعریف ہے اور محبت کے سوز و ساز سے کائناتِ جاں کو معمور و منوّر کرنے کا حوصلہ ہے۔ پھر حمد باری تعالیٰ اس طرح کرتے ہیں:

بنامِ آں کہ عشق آموزِ دل ہے — چراغ افروزِ شمع سوزِ دل ہے
عطا کی اُن نے گل کو شکل زیبا — کیا بلبل کو اُن نے ناشکیبا

حمد کے گیارہ اشعار کے بعد نعت حضرت سید المرسلین میں ۱۰ شعر ہیں۔ اس کے بعد چار شعر مناجات کے ہیں۔ پھر اصل قصہ شروع ہوتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے:-

کہ تھا پنجاب میں اک مردِ درویش — گرفتارِ بلائے حالتِ خویش
گدازِ عشق سے از خویش رفتہ — ہو جوں گرم چکیدن موم تفتہ

---

[1] یہ بھی غلطی سے سودا کی طرف منسوب ہے لیکن اصل میں قائم ہی کی زائیدہ فکر ہے۔ [دیکھو کلیاتِ سودا صفحات ۲۱۲ و ۲۱۳]

برنگِ شمع سر سے پاؤں تک نار　　پہ تھی اک اشتعالک اس کو درکار

اس درویش نے جنگل میں اپنی ایک صاف ستھری کٹیا بنا رکھی تھی جو ایسے دلکش اور دلکشا مقام پر واقع تھی کہ :-

مسافر جو کوئی اس راہ آتا　　وہ دل سے یادِ منزل بھول جاتا

ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ ایک بارات ادھر سے گزری۔ یہ جگہ براتیوں کو آرام دہ اور پُربہار نظر آئی۔ وہ سب وہاں اتر پڑے اور

جہاں پر قافلہ اترا تھا سارا　　وہیں اک سمت دُلہن کو اتارا
ہوئی گرمی سے ڈولی کی وہ جب تنگ　　کیا اُن نے ہوا کھانے کا آہنگ
دوچار اس سے ہوا یہ مردِ درویش　　گیا بیچارہ اک جھپکی میں از خویش
نگاہوں میں رہا صد بحث و تکرار　　نہ تھا ہر چند واں امکانِ گفتار

دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوئے۔ نگاہوں ہی نگاہوں میں عہد و پیمان بھی کر لیے اور جب دھوپ کی تمازت کم ہوئی تو جدائی کا دلدوز وقت آیا :-

نہ اُس کو کچھ سخن کہنے کا یارا　　نہ اس کو جز خموشی اور چارا
یونہیں باہم تھے یہ محوِ بلا ہا　　کہ ناگہ واں سے وہ ڈولا اٹھایا
گئے وہ اُس طرف اور یہ غمناک　　کہے تھا زیرِ لب باچشمِ نم ناک
کہ اے گردونِ دُوں یہ کیا کیا تیں　　وہ دل ما نعدیوں از راہ کیا ہیں
میں ہوں وہ تشنہ کام دشتِ حسرت　　نظر آیا جسے پانی بکثرت
گیا نزدیک جب اُس کے پس از دید　　تو دیکھا اک سرابِ خشک اور سیر

بہر حال برات رخصت ہو گئی۔ وہ درویشِ دل ریش ایک درخت پر چڑھ کر برات کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

جہاں تک قوتِ مدِ نظر تھی　　یہ تھا یاں اور نگہ اس کی اُدھر تھی
نظر آنے سے مطلق رہ گیا جب　　ہوا وہ روتا اس پہ تیرہ جوں شب

گرا اوپر سے نیچے واں یہ مجروح گئی دُنبال ڈولی کے چلی رُوح

درخت سے گر کر درویش کا انتقال ہو گیا تو لوگوں نے مشورہ کر کے اسی کٹیا میں اس کی قبر بنادی۔ یہاں تو درویش نے اپنی جان نچھاور کی وہاں اس کی محبوبہ بھی آشفتہ حال تھی:۔

غرض یہ عشق جب کھولے ہے پردے جو حائل کوہ ہو تو شیشہ کر دے

یہ ادنیٰ اِک محبت کا اثر ہے کہ دل کو حال سے دل کے خبر ہے

یہاں قائم نے ایک مثال بھی دی ہے کہ عاشق و معشوق کا ایک ہی حال ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک بار لیلیٰ نے فصد کھلوائی:

ہوا جاری رگِ لیلیٰ سے یاں خوں چھٹی بے نیشتر واں فصد مجنوں

اس ضمنی حکایت کو بھی کئی اشعار میں بیان کر دیا ہے۔ قصہ مختصر یہ:۔

کہ جب وہ نازنیں گھر بیچ آئی دیا ہر ایک نے جی رونمائی

کیے سب نے نچھاور اِس قدر دُر کہ صحنِ خانہ گوہر سے ہوا پُر

دلہن کے عزیز و اقارب تو شادی کی رنگ رلیاں منا رہے تھے مگر اس غریب کے دل کا عالم ہی عجیب تھا۔

برنگِ زُلف گہ آشفتہ اطوار گہے جُوں نرگسِ مخمور بیمار

نسیم آسا اڑاتی تھی کبھو خاک کبھی جوں گل کرے تھے پیرہن چاک

کبھی نوچے تھی سر کے بال غم سے کبھی نالاں تھی فرقت کے الم سے

سبھوں نے اپنی اپنی عقل کے موافق اس کے آزار کا علاج کرنا چاہا مگر کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو یہ صلاح ٹھہری کہ اُس کے گھر والوں کو خط لکھ دیا جائے کہ کوئی آکر اسے لے جائے۔ شاید اپنے گھر کے ماحول سے مانوس ہو کر اس کا آزار جاتا رہے۔ چنانچہ خط لکھ کر ایک قاصد کو بھیج دیا گیا۔ خط میں لکھا تھا کہ:۔

وہ نادیدہ خزاں، گل برگِ نوخیز ہے جوں شاخِ کہن، ہر دم ورق ریز

خدا جانے کہ اس کو کیا بلا ہے بدا تقدیر کا کیوں کر ہے؟ کیا ہے؟

خط لے کر قاصد جب دلہن کے گھر پہنچا اور اس کا حال ماں باپ کو بتایا تو وہ بے تاب ہوکر فوراً اسے لے آنے کے لیے چل پڑے۔ یہاں آکر انھوں نے احوال دریافت کیا تو یہی طے پایا کہ اسے اپنے ساتھ گھر لے جائیں۔ اگلی صبح سب لوگ تیار ہوگئے، اور دلہن کو لے کر وہاں سے اپنے گھر کی طرف چل پڑے۔ ایک پیرزن کنیز دلہن کی دیکھ بھال کے لیے ساتھ تھی جس کی کاروانی اور کہن سالی کا یہ عالم تھا کہ "تھی گویا مادر گیتی کی نانی"۔

دونوں ایک ہی سواری میں بیٹھے۔ کنیز نے دلہن کو باتوں اور قصوں میں الجھائے رکھا۔ اتنے میں اس درویش کا تکیہ آگیا۔ اور سب آرام کے لیے وہاں اتر پڑے۔ یہ نازنین جس وقت درویش کی قبر کے پاس پہنچی، اچانک ایک تڑاخا ہوا۔ وہ قبر شق ہوگئی اور دلہن اس میں سما کر درویش سے ہم آغوش ہوگئی۔ وہ قبر پھر اسی طرح برابر ہوگئی۔ دلہن کے عزیز و اقارب نوحہ و ماتم کرتے ہوئے اپنے گھر واپس آگئے۔

یہ تو حکایت کا خلاصہ تھا۔ اب چند باتیں مثنوی کی تکنیک اور فنی حیثیت کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ شمالی ہند میں مثنوی کا رواج اگرچہ بہت پہلے ہوچکا تھا لیکن میر اور سودا کی مثنویوں کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ منظر کشی، جزئیات نگاری، نفسیاتی ژرف بینی اور تسلسلِ بیان کے اعتبار سے پچھلی کوششوں پر بھاری ہیں۔ قائم چاندپوری بھی میر و مرزا کے معاصر ہیں۔ ان کی یہ مثنوی بھی ان خوبیوں کی حامل ہے۔ مزید خوبی یہ کہ اس کی زبان بہت عمدہ اور مرصع ہے۔ خوش نما بندشیں، چست ترکیبیں، خوبصورت الفاظ اور دل نشیں انداز بیان ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے میر اور سودا کی کسی مثنوی میں اتنی مرصع کاری اور صناعی نہیں ملتی جتنی قائم کی اس مثنوی میں ہے۔ جزئیات نگاری تو اتنی ہے کہ ضمنی باتوں کو بھی اچھے خاصے شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ البتہ ایک کمزوری اس عہد کے قصوں میں عام طور سے ملتی ہے۔

جس سے قائم بھی اپنی مثنوی کو محفوظ نہیں رکھ سکے یعنی فوق فطرت مناظر یا واقعات کی آمیزش ـــــــ اگرچہ قائم کا دعویٰ ہے کہ وہ "مرد درویش" پنجاب کا رہنے والا تھا، مگر انھوں نے اس کے کردار پر زیادہ محنت نہیں کی، نہ قصّے کے ہندستانی ماحول کو ہی پوری طرح نمایاں کیا ہے، میر حسن کی طرح شادی کی رسموں اور جہیز دلہن کا ذکر، کھانوں کی تفصیل یا عمارتوں کا ایسا حال بھی نہیں جس سے ہندستانی ماحول کی نشاندہی کی جا سکے۔ پھر بھی اس میں غیر ہندستانی ماحول نہیں ملتا۔ قصہ میں عشق کی ابتدا درویش کی طرف سے ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ یہاں ایرانی روایت کا اتباع کیا گیا ہے، لیکن دلہن کا اس درویش پر نچھاور ہونا ہندستانی عورت کی وفاداری کا ایک واضح نمونہ ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ ایک ہند ایرانی قصّہ کہا جا سکتا ہے جس کا انجام کچھ زیادہ غیر متوقع، چونکا دینے والا یا متاثر کرنے والا نہیں۔

مثنوی کا قصہ بہت ہی مختصر ہے۔ اور کردار بھی دو ہی ہیں۔ ڈرامائی مناظر کے اعتبار سے اسے ایکانکی کہا جا سکتا ہے۔ وقت کا بھی اس میں احساس نہیں ہوتا۔ دونوں کرداروں کی نفسیاتی گرہ کشائی بھی نہیں کی گئی۔ اتنی کمزوریوں کے باوجود جو چیز اس مثنوی کو اہمیت دیتی ہے وہ ایک تو اس کی قدامت ہے۔ یعنی ہم میر و مرزا کے زمانہ کی مثنویوں کا تقابلی مطالعہ کرتے وقت اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ دوسرے مثنوی کے آخر میں خود شاعر نے لکھا ہے کہ میں نے یہ قصّہ لکھنے کے لیے ایک ہفتہ تک خون جگر پیا ہے۔ اگر قائم قصّے کے بنیادی اوصاف سے باخبر ہوتے، اس کی ترتیب میں ایک ہفتے سے زیادہ خون جگر پیتے اور اس کی زبان کو مکالموں سے زیادہ قریب کر دیتے، جس سے مثنوی کے تسلسل کے ساتھ ڈرامائی عنصر بھی شامل ہو جاتا تو بلاشبہ یہ مثنوی ان کے عہد کی ایک نمایندہ مثنوی ہوتی۔

ابھی ایک مسئلہ فیصلہ طلب ہے کہ اس کا سالِ تصنیف کیا ہے؟ اگر یہ میر کی

مثنوی" دریائے عشق" اور شعلۂ عشق کے بعد لکھی گئی ہے تو ہم قائم سے یہ مطالبہ کرسکتے ہیں کہ وہ میر کی مثنویوں کو اپنے لیے نمونہ بناتے جو اگرچہ زبان و بیان کے اعتبار سے اتنی "جڑاؤ" نہیں۔ تاہم فنی حیثیت میں اپنے عہد کی مکمل مثنویاں ہیں۔ ان میں قصہ کے اوصاف بھی ہیں اور ڈرامائی عنصر بھی ــــ سودا کی مثنویاں ان کی ہجویات اور قصائد کی طرح بیانیہ ہیں۔ اور قائم چونکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کے مقلد ہیں۔ اس لیے ان کی مثنوی کا انداز بھی بیانیہ ہوگیا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ کوئی مثنوی محض بیانیہ انداز کے سہارے فنی اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی مثنوی نہیں ہوسکتی۔

پھر بھی قائم کی مثنوی کے منفرد خط وخال اسی وقت اچھی طرح واضح ہو سکتے ہیں جب اس عہد کی دوسری مثنویوں سے اس کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔

(۱۵) مثنوی" قصہ نٹ" مسمّٰی بہ حیرت افزا۔ دیوان قائم نسخہ انڈیا آفس لندن میں یہ مثنوی ورق ۱۸۲ (الف) سے شروع ہوتی ہے اور ورق ۲۰۰ (ب) تک چلی گئی ہے اس میں ، ۸۴۰ اشعار ہیں اور ایک نٹ کی بازی گری کا قصہ بیان ہوا ہے۔ دیوانِ قائم کے نسخہ رام پور میں یہ مثنوی نہیں ہے۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:-

سزاوارِ حمد و ثنا ہے وہ اسم　　　کہ باندھا ہے جن نے فلک سا طلسم

حمد ونعت کے بعد اصل قصہ شروع ہوتا ہے جس کا ملخص یہ ہے کہ:-

شب اک مردِ دانائے فرخندہ رائے　　　کہے تھا یہ احوالِ حیرت فزائے

کہ تھا ہند میں پیش ازیں ایک شاہ　　　نہ شہ بلکہ خورشید انجم سپاہ

عجب وقت تھا اور عجب روزگار　　　کہ تھا اہلِ فن کا یہ عزّ و وقار

اک اس وقت میں ہم نے سیکھا ہنر　　　کہ ہے یاں ہنر عیب سے بھی بتر

جو ہر بات میں اب جواہر ہوں پُر　　　نہ دے خاک کوئی چہ جائے کہ دُر

دیا عیش کو ان کے اک دن رواج — کہ ہو منعقد جشن کی بزم آج
ہیں اس شہر میں اہلِ فن جس قدر — سب اپنا وہ دیں آکے عرضِ ہنر
نشیمن میں بیٹھا شہِ مسلمین — صدا نکلی ڈنکے سے یہ دین دین"

غرض جشن کا آغاز ہوا۔ بہت سے بازی گر حاضر ہوئے اور زمین خدمت چوم کر انھوں نے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا۔ اسی اثنا میں ایک بازی گر مع اپنی خوبصورت اور جوان بیوی کے پیش ہوا اور اپنے کرتب دکھانے کی اجازت چاہی۔ قائم نے اس عورت کا سراپا بھی مزے لے لے کر بیان کیا ہے :۔

نہ بازی گر اک آکے حاضر ہوا — کھڑے ہو کے کی دور شہ کو دعا
کہ اوّل پس از رخصتِ شہر یار — ہوئی ایک زن ان سے سرگرم کار
لگی باجنے ڈھول گت پر دو سو — ہوئی کچھ کے وہ رشکِ مہرو برو
کروں کیا میں صورت کا اس کی بیاں — کہ ہر عضو اس کا تھا آشوب جان
تھی خلقت سے اس آبِ گل کی بری — نہ جانے کہ تھی حور، وہ یا پری
جو تھا قد میں اس کے تخیلا پناں" — کہاں پائی برچھی نے ایسی سناں
نہ تھے ایک بال اس کے جی کا وبال — لیے جاتا تھا دل کو چہرے کا خال
کہوں کیا تبسم کی اس لب کے بات — گویا موج مارے ہے آبِ حیات
لگے جس کی آنکھ اس کے سینے کے ساتھ — جیے جب تلک مارے سینے پہ ہاتھ
کچ اس کے کہ تھے سب بدن اہول — بنائے تھے یہ دستِ قدرت نے گول
گویا وقت خوبی کی تعمیر کے — ڈھلے ہیں یہ سانچہ میں تقدیر کے
تھی یہ صاف و نرم اس پری وش کی گات — صفا کو کیا جن نے مخمل کی مات
بہر حال جس دم وہ رشکِ پری — ہوئی مستعد بہرِ بازی گری

چنانچہ اس مغنی نے بانس پر چڑھ کر تماشا دکھایا اور حاضرین سے خراجِ تحسین وصول کیا :۔

سماں یہ تھا واں ہر طرف آشکار — کہ جوں شعلہ رقصاں ہو بالائے خار

ہے جیسے کہ رقصندگاں کا سبھاؤ — بجاتی تھی گھنگھرو بتاتی تھی بھاؤ

اس کے بعد نٹ کے کرتب دکھانے کی باری آئی اس نے بھی نئے نئے شعبدے دکھائے:-

رکھے تھا یہ سر نوکِ خنجر پہ یوں — کہ ہو اوس کی بوند کانٹے پہ جوں

یہاں قائم نے قصّے میں اخلاقی پہلو پیدا کیے ہیں اور اسی ضمن میں بعض تمثیلات سے کام لیا ہے۔ نٹ کو بادشاہ نے بہت سے انعام واکرام سے نوازا اور اس کے کمالِ فن کی تعریف وتحسین کی۔ اب نٹ کہنے لگا کہ حضور مجھے اجازت مرحمت فرمائیں تو میرا ارادہ جم سے جنگ کے لیے جانے کا ہے اس نے میرے باپ دادا کو بے قصور ہلاک کیا تھا میں اس سے انتقام لینا چاہتا ہوں اگر میں واپس آگیا تو خیر ورنہ میری نٹنی حضور کے پاس امانت رہے گی۔

کہا شہ نے کا اے مردِ بیہودہ گو — یہ کیا بات بے ہودہ کہتا ہے تو
کہیں بھی تری بات کا کچھ ہے ڈھنگ — کرے کس طرح جم سے انسان جنگ
یہ نٹ نے وہیں کرکے شہ کو سلام — کمر کس کے ہتھیار باندھے تمام
اُڑا اور ہوا اس کے اُڑنے کا شور — اُڑے جس طرح مرغِ وحشی بہ زور
لگی کہنے نٹنی کہ اے بادشاہ — ہوا گرم واں عرصۂ رزم گاہ
جو چلتا نہیں چرخ پہ تیغ و تیر — تو کیوں حالِ دوراں میں آیا تغیر
اسی طور سے تھی یہ واں گفتگو — کہ ٹپکا کچھ اک آسماں سے لہو
جو نٹنی نے دیکھا وہ آنکھوں سے خون — گیا اس سے یکبار صبر و سکون
کہا اے وائے زخمی ہوا وہ جواں — کہ مانگے تھا جس سے فلک الاماں

غرض نٹنی نے آہ و فریاد بلند کی۔ بادشاہ اور حاضرین کو یقین ہوگیا کہ نٹ آسمان پہ جم سے جنگ کرتے ہوئے ہلاک ہوگیا۔ اس نٹنی نے وہ تازہ خون اپنے چہرے پہ مل لیا اور بین کرکے رونے لگی۔ آسمان سے ایک ایک کرکے نٹ کے اعضا بھی گرے جنھیں فراہم کرکے اس کی ارتھی تیار کی گئی۔ نٹنی نے ارتھی کے ساتھ

ستی ہونے کا ارادہ کیا تو بادشاہ نے اسے سمجھایا کہ کیوں ناحق اپنی جان گنواتی ہے۔ لیکن وہ باز نہیں آئی جب بادشاہ نے اسے فرطِ شوق سے بے قرار اور آتشِ عشق کو ملتہب پایا تو اسے اجازت دینے پر مجبور ہو گیا چنانچہ نٹنی نے حمام کر کے لباسِ فاخرہ پہنا اور سنگار کیا۔ تمام زیور پہنے اور خوب سج بن کر نکلی۔ اپنے شوہر کے اعضا کو جمع کر کے جوڑا، ارتھی تیار کی، ارتھی کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر چلی۔ خلقت کا بڑا انبوہ ساتھ ساتھ ہولیا صحرا میں ایک جگہ پہنچ کر عود و صندل کی لکڑیاں فراہم کیں اور جب چتا تیار ہو گئی تو اس میں نٹنی بیٹھ گئی اور نٹ کے مردے سے باتیں کرنے لگی:۔

کہ آخر ہے اب، وقت تک چشم کھول!
لبِ لعل سے اپنے عاشق سے بول

آخر چتا میں آگ لگائی گئی اور دونوں جلنے لگے۔ تھوڑی دیر میں جل کر راکھ ہو گئے۔ سب لوگ وہاں سے بڑی حسرت لے کر واپس ہوئے۔ اس واقعہ کے بعد سے بادشاہ کو سخت حیرت اور تشویش لاحق رہی۔ کھانا پینا اور سونا بھی حرام ہو گیا۔ اسی غم میں گھلنے لگا طبیبوں نے دوا دارو میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا مگر بادشاہ کے دل سے اس واقعے کا غم محو نہ ہوتا تھا۔ ساری رنگ، رلیاں بھول گیا۔

اعیانِ دولت نے ایک دن صلاح کی کہ بادشاہ کی دل جوئی کے لیے پھر ایک بزمِ جشن منعقد کریں شاید اسی سے غم غلط ہو، بڑے کرّ و فر کے ساتھ جشن کا انتظام ہوا، دور دراز شہروں سے نامی گرامی بازی گر اپنے ہنر کا مظاہرہ کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ عین جشن کی حالت میں وہ نٹ جو پہلے آسمان پر جنگ کرتے ہوئے ہلاک ہو چکا تھا اور اس کی لاش ستی کر دی گئی تھی اچانک پھر آ دھمکا لوگوں کو سخت حیرت ہوتی اور یہ سمجھے کہ یہ نٹ نہیں اس کی خبیث روح ہے جو متشکل ہو کر سامنے آگئی ہے۔ نٹ نے بادشاہ سے عرض کیا کہ

حضور کے اقبال سے میں نے جم کو شرق سے غرب تک ہرا دیا ہے اور اس کی ساری فوج کو مار بھگایا۔ اب میں حاضر ہو گیا ہوں میری لونڈی مجھے مرحمت فرمادی جائے۔ بادشاہ نے کہا:-

کہا شہ نے کا سے مرد صاحب ہنر خدا سے ڈر اتنی ڈھٹائی نہ کر!
وہ زن ساتھ تیرے بصد درد و غم اسی روز جل کر ہوئی تھی بھسم

یہ بات میں ہی نہیں کہتا ایک عالم اس کا چشم دید گواہ ہے۔ نٹ نے کہا کہ مجھ سے یہ بازی گری کرنے کی کیا ضرورت ہے اگر وہ عورت آپ کو پسند آگئی ہے تو صاف کہہ دیا جائے جھوٹ بول کر ایمان خراب کرنے سے کیا فائدہ ہے

غرض بعد ہنگامہ ٹھہری یہ رائے کہ نٹ دیکھ لے چل کے خلوت سرائے

نٹ بادشاہ کے محل میں پہنچا اور اس نے وہاں جاکر آواز دی کہ بادشاہ نے تجھے کہاں بند کر دیا ہے؟ جہاں ہو آواز دے۔

دیا نٹ کو پردے سے زن نے جواب کہ لی تیں خبر خوب میری شتاب
رہی اتنی مدت میں جس شکل سات کہوں کیا کہ ناگفتنی ہے وہ بات

یہ جواب سن کر نٹ نے پردہ اٹھایا تو وہ عورت اسی طرح زیب و زینت سے آراستہ پیراستہ نکلی۔

کہا نٹ نے کا سے بادشاہ امیں امانت پہ تیری ہزار آفریں
کہ اس قحبہ گندہ کس کے لیے یہ سب شاہ عالم نے حیلے کیے

بھلا بادشاہ کو میری امانت میں خیانت کی کیا ضرورت تھی اگر یہ نٹنی حضور کو پسند تھی تو میں اس سے دست بردار ہو جاتا۔ جب نٹ نے ایسی ہی حیرت انگیز اور ظرافت آمیز باتیں کیں تو بادشاہ کو انبساط ہوا اور اس کے دل سے غم کا اثر دور ہوا۔

یہ مثنوی یہاں تمام ہو جاتی ہے۔ اب اس کے آخر میں قائم نے کچھ

اپنی کیفیت لکھی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس زمانے میں "پراگندہ روزی پراگندہ دل" ہو رہے تھے اور شعر و سخن سے بھی کچھ زیادہ قلبی لگاؤ نہیں رہا تھا۔ یہ اشعار ان کے سوانح نویس کے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں:

کہاں تک یہ افسانہ ہائے کہن — کہ اب حال پر اپنے ختم سخن
کہ ہے ان دنوں دل پہ یہ اضطرار — کہ ہے زندگی موت سے ناگوار
جس انداز سے دل میں کھٹکے ہے سانس — کرے وہ خلش کب جراحت میں پھانس
لیا ہے بہ سبب فقر و فاقہ نے گھیر — کہ خوش ہوں اگر آؤں جینے سے سیر
سو دن کو جو دوں فکر روزی میں جان — تو جز اشک کے آب و دانہ کہاں
کبھو جی کو غم سے رہائی نہیں — خوشی سے گویا آشنائی نہیں
یہ شعر و سخن سے ہے دل کو ملال — کہ گزریں ہیں اس ذکر کو ماہ و سال
مگر غم نے ایسا ہی دل خوں کیا — تو کوئی مصرع آہ موزوں کیا
ہو جس شخص پر زیست یاں تک محال — بھلا جمع کیوں کر ہو اس کا خیال
وہ جانے جسے اس میں کچھ ہو شعور — کہ اس کام کو ہے فراغت ضرور
سو اس حال میں ایک مشفق نے رات — کہی مجھ سے از راہ شفقت یہ بات
کہ لے کاغذ و خامہ اور عزم کر — یہ قصہ ہے نادر اسے نظم کر
مرتب ہوا جب بچندیں شتاب — دیا "حیرت افزا" میں اس کو خطاب
سو خدمت میں تیری ہے اب یہ سوال — کہ ہوں میں کرم پیشہ اہل کمال
کسی خورد کا عیب دیکھیں ہیں گر — بزرگی سے ڈھانپیں ہیں اس کو ہنر
ہوا ہے یہ جس سنہ میں نامہ رقم — ہے بارہ سو ہجری میاں سات کم

اس کے آخر میں لکھا ہوا ہے "تمام شد مثنوی حیرت افزا تصنیف میاں قائم صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ"۔ اس کے آخری شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۱۹۳ھ میں یہ مثنوی لکھی گئی اور قائم نے اسے ایک نشست میں لکھ لیا تھا۔ قائم کے اس بیان پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ وہ قادر الکلام اور زود گو شاعر تھے اور یہ قصہ

انھوں نے تفنّنِ طبع کے لیے لکھا تھا۔

فنی محاسن کے اعتبار سے یہ مثنوی اس عہد کی مثنویوں میں ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس میں بیان پیچیدہ نہیں رواں اور سلیس ہے۔ بعض حصّے خصوصًا نٹنی کا سراپا اور اس کا نٹ کی موت پر فریاد وزاری کرنا بہت اچھے نظم ہوئے ہیں۔ اصل کے اعتبار سے یہ خالص ہندستانی قصّہ ہے مگر اس کی نوک پلک اور سنواری جاتی تو تکنیک کا حسن بھی پیدا ہو جاتا۔ اس کا خاتمہ تحیّر پیدا نہیں کرتا حالانکہ قصّہ میں تحیّر موجود ہے لیکن نظم میں اس کا اظہار اچھی طرح نہیں ہو سکا ہے۔ بعض حصّے غیر ضروری طور پر طویل بھی ہو گئے ہیں لیکن تناسب کی یہ کمی ایسا نقص ہے جس میں یہ مثنوی منفرد نہیں ہے۔ اس دور کی تقریبًا سبھی مثنویوں میں یہ سقم ملتا ہے۔ یہ بات بھی خاص طور سے غور طلب ہے کہ مثنوی حیرت افزا، میر حسن کی سحر البیان سے پہلے تصنیف ہوئی ہے اور اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ شمالی ہندستان میں مثنویوں کے لیے فنی میدان بارہویں صدی ہجری کے نصف آخر میں پوری طرح ہموار ہو چکا تھا اور اس کا اظہار پہلی بار سحر البیان ہی میں نہیں ہوا ہے ——— (۱۹۵۹)

مصحفی کی زبان

ہمارے ایک محترم بزرگ کو اس زمانے کے نقادوں اور محققوں سے یہ شکایت ہے کہ وہ جب تاریخ ادب اردو کے کسی بھی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کو دو چار صلواتیں سنانا اور ان کی کتاب "آب حیات" کے پایۂ استناد کو زیر بحث لانا من جملۂ واجبات تحقیق جانتے ہیں۔ یہ بات اس حد تک صحیح ہے کہ بعض لکھنے والوں نے اپنے محدود اور ناقص مطالعے کی بنا پر بے سر و پا اعتراض کر دیے اور اس ذمہ داری کو محسوس نہ کیا کہ ایک اتنے مقبول مصنّف اور مسلم الثبوت انشا پرداز کی کسی غلطی کا اعلان کرنے سے پہلے یہ بھی اطمینان کر لیا جائے کہ اُن کے حق میں جو دلائل مل سکتے ہیں وہ بھی قوی ہیں یا نہیں۔ لیکن اگر یہ شکایت اس نظر سے ہو کہ آزاد کی شخصیت کے گرد کوئی تقدس کا ہالہ کھنچا ہوا ہے اور انھیں تنقید سے بلند و بالا قرار دے دینا چاہیے تو تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جن شخصیات کو واقعی ایسا تقدس حاصل رہا ہے انھیں بھی تنقید سے معاف نہیں رکھا گیا۔ یہ تو اس دور کی بات ہے جب زندگی کے ہر شعبہ کو ہدایات اخلاقیات سے ملتی تھیں اور یہ اخلاقیات مذہب کی ساختہ ہوتی تھی۔ آج کی رفتار یہ بتا رہی ہے کہ مذہب اور اخلاق دونوں اپنی گرفت کھو رہے ہیں اس لیے لامحالہ کل رائج ہونے والے معیار بھی ہمارے قبضے میں نہیں ہوں گے۔

اگر ہم ان اخلاقی معیاروں کی ساکھ باقی رکھنا چاہتے ہیں تو اس کا صرف یہی راستہ ہے کہ ہم اس تنقید کا منصب بھی اپنے ہی اختیار میں رکھیں اور خود احتسابی کی عادت ڈالیں۔ آزاد کے بعض نقادوں کی یہی کمزوری ہے کہ وہ اعتراض کرنے سے پہلے پوری طرح اطمینان نہیں کرتے خواہ مخواہ چٹکی لیتے ہیں تخیّل کے بل بوتے پر نکتہ چینی کرتے ہیں اور آزاد کو زبان اردو کے معماروں میں جو بلند اور لائق احترام درجہ حاصل ہے اسے ملحوظ رکھ کر بات نہیں کرتے مگر لطف یہ ہے کہ جن لوگوں کو آزاد سے کچھ جائز شکایات ہیں ان کا کہنا یہی ہے کہ یہ ساری کمزوریاں ان مرحوم میں بھی موجود تھیں۔ پچھلی چوتھائی صدی میں آزاد کی کتاب "آب حیات" پر جو اعتراضات ہوئے ہیں یہاں انھیں دہرانا یا شمار کرنا مقصود نہیں لیکن اس کا آغاز شاید مولانا شبلی نے کیا۔ زمانۂ مابعد میں کسی حد تک حافظ محمود شیرانی نے ان کی کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی۔ اور آج سے چند سال قبل قاضی عبدالودود صاحب نے ایک مبسوط مضمون "آزاد بحیثیت محقق" لکھ کر گویا اس سلسلے کی تکمیل کردی۔ انفرادی موضوعات پر جن حضرات نے کام کیا انھوں نے اپنی تحقیقات کے نتائج پیش کرتے ہوئے علی العموم یہ ظاہر کرنا ضروری سمجھا کہ وہ اس موضوع پر آزاد کی رائے سے کہاں تک اتفاق نہیں کرتے یا ان کی فراہم کردہ معلومات پر کیا اضافہ کر رہے ہیں۔ ان سب متفرق تحقیقات کو اگر یک جا کر لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ شاید آب حیات کا ایک صفحہ بھی اعتراض سے نہیں بچا ہے۔ ان سب کوششوں سے دل گرفتہ ہونے کی بجائے بہتر یہ ہوگا کہ آب حیات کا ایک تنقیدی ایڈیشن مرتب کیا جائے اور یہ سب معلومات متقاطع بیانات یا نئے انکشافات حواشی میں درج کر دیے جائیں۔ یہاں غیر متعلق مثالوں کا اندراج کرکے اس تمہید کو زیادہ طول

نہیں دوں گا۔ مگر جن حضرات کو یہ شکایت ہے کہ ہر کس و ناکس "آب حیات" کو مورد طعن کیوں بناتا ہے انھیں صرف ایک نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیے آب حیات کو تاریخ اور تذکرے کی کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اگر اسے صرف قصہ کہانی کی کتاب یا زیادہ سے زیادہ "شاعروں کے خاکے" قرار دے دیا جائے تو ان میں سے اسی فی صدی اعتراضات اپنی موت آپ مر جائیں گے۔ مگر غالباً آزاد کے مداح اس تبدیلی کے لیے تیار نہ ہوں گے کیوں کہ آزاد خود اس کتاب کو "مشاہیر کے سوانح اور زبان کی تاریخ" کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ سوانح بھی تاریخ کا ایک اظہار ہیں اور تاریخ میں دو باتوں کو ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے ایک تو یہ کہ مورخ اپنے تخیل کو اس میں شاہد عینی کی طرح پیش کرنے لگے اور دوسرے یہ کہ وہ افراد یا حوادث سے اپنا جذباتی رشتہ قائم کرلے۔ پہلی بات کے بارے میں مارگولینتھ نے لکھا ہے کہ مورخ کبھی کبھی غیب داں بھی بن جاتا ہے یا کسی واقعہ کے بارے میں نہایت سنجیدگی اور دیانت سے یہ تصور کرلیتا ہے کہ یہ بات اس طرح ہوئی ہوگی کیوں کہ ویسی باتیں عالم شہود میں اسی طرح ہوا کرتی ہیں۔

دوسری بات جذباتی وابستگی کے بارے میں ہندستان کے ایک مشہور مورخ سے میں نے ایک جلسے میں سوال کیا کہ آپ اپنی کتاب میں اتنے جذباتی کیوں ہو گئے ہیں۔ ان کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ یہ راز کوئی ماہر نفسیات ہی سمجھ سکتا ہے۔ آزاد کے یہاں اتفاق سے دونوں طرح کی جذباتیت ہے منفی بھی اور مثبت بھی یعنی انھیں عقیدت ہوتی ہے تو ذوق کے چیچک کے داغ بھی گل بوٹے نظر آتے ہیں اور کسی سے چڑ ہوتی ہے تو مرزا مظہر جیسے بزرگ کے لیے لکھتے ہیں کہ گھر میں دھوبن ڈال رکھی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ بیانات ہیں جن سے کوئی تاریخی معلومات نہیں ملتی اس لیے اگر یہ

باتیں بالفرض درست بھی تھیں تو انھیں بآسانی نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔ مگر اس انداز نظر کا ایک منطقی نتیجہ تضاد ہوتا ہے چنانچہ اگر آب حیات کا مطالعہ اس نظر سے کیا جائے کہ اس میں کہاں تک مربوط اور منضبط تنقید ملتی ہے تو حیرت انگیز نتائج برآمد ہوں گے۔ میر حسن دہلوی کے ترجمہ میں آزاد نے لکھا ہے کہ ان کی زبان صاف فصیح اور دل کش ہے " جو کچھ اس وقت کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جو آج ہم تم بول رہے ہیں " (آب حیات ۲۵۴-۲۵۵) انہی میر حسن نے اپنے بیٹے میر خلیق کو مصحفی سے زبان سیکھنے کا مشورہ دیا تھا اور یہ کہا تھا کہ اس زمانے میں ان کی نظیر نہیں ہے جہاں تک ہو سکے ان سے کچھ حاصل کر لو۔ (تذکرۂ ہندی طبع اول صفحہ ۹۰) چنانچہ میر خلیق بھی اپنے باپ کے ارشاد کی تعمیل میں زیادہ سے زیادہ وقت مصحفی کی خدمت میں گزارتے تھے۔

میر حسن جو بقول آزاد "خاص دہلوی" تھے۔ اور جن کی استادی کا اعتراف تمام اہل لکھنؤ کو بھی ہے وہ تو مصحفی کی زبان دانی کے بارے میں محض لفظوں کی حد تک نہیں بلکہ عملاً اس طرح معترف تھے کہ انھوں نے اپنے بیٹے سے تاکیداً کہا کہ ان کی خدمت میں رہ کر زبان اور فن کی تکمیل کرو مگر آزاد نے مصحفی کے ترجمہ میں جو کچھ لکھا ہے اسے ذرا غور اور تامل سے ملاحظہ فرمائیے تو مطلب یہ نکلتا ہے کہ زبان اور ضروریات شعری سے باخبر تھے اور یہ دہلی کے بزرگوں کی صحبت میں حاصل کی تھی۔ خود دہلی کے رہنے والے نہ تھے مگر اپنے دہلوی ہونے کا فخریہ اعلان کرتے تھے۔ شاعری میں کہیں میر کا انداز ہے کہیں سوز کی نقل ہے کہیں سودا کا چربہ ہے۔ ان کا اپنا کوئی طرز نہیں "غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے تھے کسی طرز خاص کی خصوصیت نہیں۔ بعض تو صفائی اور برجستگی میں لاجواب ہیں بعض میں یہی معمولی باتیں ہیں جنھیں ڈھیلی ڈھیلی بندشوں میں باندھ باندھ

کر ٹھپسر ٹھپسر برابر کہتے چلے گئے ہیں۔ اس کا سبب یا تو بُر گوئی ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے یا دلّی اور امروہہ کا فرق ہے۔" (آب حیات ۳۱۲)

دوسری جگہ پھر مصحفی کے امروہوی ہونے پر چوٹ کی ہے اور کہتے ہیں " سید انشا ہمیشہ قواعد کے راستے سے ترچھے ہو کر چلتے ہیں مگر ان کا ترچھا پن بھی عجب بانکپن دکھاتا ہے۔ یہ بھی مطلب کو بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہیں مگر کیا کریں وہ طبیعت کا امروہہ پن نہیں جاتا۔" (آب حیات ۳۱۳) یہ تعمیم کہ انشا ہمیشہ قواعد سے ترچھے ہو کر چلتے ہیں مبالغے سے خالی نہیں اور آزاد نے اس کج روی کی کوئی مثال بھی نہیں دی ہے۔ جنبہ داری اسی سے ظاہر ہے کہ ایک شاعر کی قواعد شکنی کی بھی تعریف ہو رہی ہے اور دوسرے کی پابندی فن کے لیے بھی یہ کہ " کہیں پھیکے ہیں اور کہیں سیٹھے ہیں۔" (آب ۳۱۳) مصحفی کی زباندانی پر اتنے سخت ریمارک دینے کے بعد یہ ضروری تھا کہ آزاد اس کی کچھ مثالیں بھی پیش کرتے کہ ان کے محاورے میں کہاں جھول ہوتا ہے۔ چنانچہ آگے چل کر لکھا ہے کہ " بعض جگہ اپنے وطن کا محاورہ یاد آجاتا ہے اور کہہ دیتے ہیں :

تیغ نے اس کی کلیجا کھا لیا
آتے ہی اس نے مجھے سنگوا لیا

چمن میں چل کے کر اے مصحفی تو نالہ و آہ
جو جی چلا ہو ترا امتحانِ بلبل کو

نہ میں صحرا میں نہ گلشن میں نکل جاؤں
خو گر شہر ہوں یاں خاک رُل جاؤں گا

(آب حیات ۳۱۵)

ان مثالوں سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ

۱۔ سنگوانا ۲۔ جی چلنا ۳۔ رل جانا

یہ تینوں محاورے دہلی کے نہیں ہیں بلکہ امروہہ کے ہیں یا بالفاظ دیگر ٹکسال باہر ہیں۔ ان میں پہلا محاورہ مصحفی نے جس سیاق میں استعمال کیا ہے وہ بظاہر سینتنا ٹھکانے لگانا یا قتل کرنا وغیرہ کے معنوں میں ہو سکتا ہے۔ یہ دہلی میں بولا جاتا تھا اور شاعری سے قطع نظر اس کی سند اس دور کی نثر میں بھی مل سکتی ہے۔ سید جمیل الدین خاں خاص دہلی کے باشندے تھے اور "محلہ جبلی پورہ عرف چوڑی والان دہلی میں رہتے تھے۔ ان کا "صادق الاخبار" بہت مشہور ہے اس نے ایام غدر میں انگریزوں کے خلاف زبردست تحریک چلا رکھی تھی۔ اس اخبار کی ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء مطابق ۳ ذی قعدہ ۱۲۷۳ھ کی اشاعت (جلد ۲ شمارہ ۱ صفحہ ۴) میں ایک خبر درج ہے جس کا اتنا اقتباس مفید مطلب ہوگا۔

"باشندے وہاں (لکھنؤ) کے اس فکر میں ہیں جس طرح بنے ان گورا رنگوں کو سنگوا بھیجیے اور مصطفےٰ شاہ برادر شاہ اودھ کو بادشاہ یہاں کا بنا دیجیے"

یہ جمیل الدین خاں امروہہ کے ہرگز نہیں تھے۔ آزاد کے لفظوں میں خاص دہلوی تھے اور آزاد سے نہ بہت زمانہ پہلے گزرے ہیں جو اس محاورہ کو متروک قرار دیا جائے نہ زمانۃً بہت متاخر ہیں بلکہ خاص ہم عصر ہیں اور قیاس چاہتا ہے کہ ان میں باہم ملاقات اور تعارف ضرور رہا ہوگا۔ آزاد نے اگر ایک محاورہ نہیں سنا تھا تو انھیں اس کی تصدیق کرنی چاہیے تھی کہ دہلی میں اس سے لوگ واقف ہیں یا نہیں۔

دوسرا محاورہ "جی چلنا" ہے۔ اس کا مفہوم بھی مذکورہ شعر سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ یعنی خواہش پیدا ہونا اور تحریک ہونا۔

نواب میرزا خاں داغ دہلوی کی زبان کو تو آزاد بھی ضرور مستند مانتے ہوں گے وہ خود ذوق کے شاگرد قلعۂ معلی کے پرورش یافتہ اور محمد حسین آزاد کے خواجہ تاش تھے۔ اصول زبان کے بارے میں بھی اتنے سخت تھے کہ انھوں نے ایک روایت کے مطابق جس کے ناقل مولوی عبدالرزاق کانپوری (مصنف البرامکہ) ہیں فرہنگ آصفیہ کے مؤلف مولوی سید احمد دہلوی کو بھی ناقابل استشہاد بتایا ہے کیوں کہ سید احمد صاحب "خاص دہلی" کے نہیں تھے۔ ان کا خاندان ہمایوں کے مقبرے کے پاس عرب سرائے کا رہنے والا تھا۔ اس لیے داغ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ عرب سرائے کے باشندے کی زبان کو تو غیر مستند سمجھیں اور خود امروہہ کا محاورہ استعمال کرلیں۔ مگر انھوں نے کیا ہے

ناصح کا جی چلا تھا ہماری طرح مگر
الفت کی دیکھ دیکھ کے افتاد رہ گیا

یہ شعر گلزار داغ کا ہے۔ "محاورات داغ" مرتبہ ولی احمد خاں میں بھی مل سکتا ہے۔ اس محاورے کی حد تک بھی یہ طے ہو گیا کہ اہل دہلی اس سے واقف تھے۔ اب تیسرا اعتراض "خاک میں رل جانا" پر رہا۔ اس کی متعدد اسناد جمع کرنی ہوں گی کیوں کہ یہ میں خود بھی نہیں سمجھ سکا کہ آزاد کا بنیادی اعتراض اس محاورے کے سلسلے میں کیا ہے۔ اس کی چند صورتیں ہو سکتی ہیں

۱۔ رل جانا (بفتح اول) جیسا کہ مصحفی نے باندھا ہے۔
۲۔ رل جانا (بکسر اول) بروزن مل جانا۔ سل جانا
۳۔ رل جانا (بضم اول) بروزن تل جانا۔ گھل مل وغیرہ

یہ تو حرکات کی صورت ہوئی۔ محاورے کے الفاظ پر بھی اعتراض ہو سکتا ہے یعنی ان میں سے کون سی صورت فصیح ہے

۱۔ خاک میں رل جانا ۲۔ خون میں رل جانا ۳۔ مٹی میں رل جانا

۴۔ قدموں میں رل جانا　　　۵۔ کانٹوں میں رل جانا

اگر یہ محاورہ کسی ایک ہی شکل میں آتا ہے تب تو اوپر لکھی ہوئی باقی سب صورتیں غلط قرار پائیں گی۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ان میں سے ہر صورت میں استعمال ہوا ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ اصل محاورہ رل جانا یا رلنا ہے اور یہ کسی بھی دوسرے لفظ سے مرکب ہو کر آسکتا ہے۔

اگر اس کا استعمال ثابت ہو جائے تو پھر زمانہ کی بحث رہے گی۔ لہذا ہم اسے قدیم ترین دور سے تلاش کرتے ہیں۔

حاتم کے بارے میں آزاد نے لکھا ہے کہ "رہنے والے خاص شاہجہاں آباد کے تھے" (آب حیات ۱۱۲) اور ان کی زبان کو فصیح مانا ہے (صفحہ ۱۱۴) ان کے دیوان قلمی (نسخہ انڈیا آفس لندن) کے ورق ۵۶ پر یہ شعر ملتا ہے

مست جائے چمن بیچ میاں عطر کو مل کر
اس بو ستی جاویں گے گل اب خاک میں رل کر

خاک میں رلنا (بفتح اول) کی یہ سند غالباً کافی ہوگی۔ مگر حاتم کے وقت کے بہت سے الفاظ اور محاورے میر و مرزا کے عہد میں متروک ہو چکے تھے۔ جیسا کہ خود مذکورۂ بالا شعر میں ستی بمعنی سے آیا ہے جو عہد میر میں ترک کر دیا گیا تھا۔ مگر یہ محاورہ "خاک میں رلنا" میر کے یہاں بھی موجود ہے

کہوں کیوں کہ یک بار وہ جل گیا
کف خاک ہو خاک میں رل گیا
(مثنوی شعلۂ شوق)

غالباً میر پر امروہوی ہونے کی تہمت کوئی بھی نہ لگاتے گا۔ اور ان کی فصاحت کے بارے میں خود آزاد نے تسلیم کیا ہے کہ "زبان کے مالک تھے" (صفحہ ۲۱۴)

ہوسکتا ہے کہ میرؔ ہی تنہا اس محاورے سے باخبر ہوں اور دوسرے فصحاء کو اس کا علم نہ ہو مگر ان کے معاصرین میں تقریباً سب کے کلام سے اس کی سند مل جاتی ہے مثلاً قائم چاندپوری :

اشک کی طرح تھی یاں مجھ کو ہر اک چشم میں جا
کب یہ معلوم تھا یوں خاک میں رل جاؤں گا

(قوافی بہل مچل وغیرہ۔ انتخاب سخن ۱/۳)

قائم چاندپور کے رہنے والے تھے اور دہلی رام پور لکھنؤ سب شہروں میں رہے تھے خود رام پور میں بھی یہ محاورہ رائج تھا چنانچہ مولوی غلام جیلانی رفعت جو پہلے بیدمؔ تخلص کرتے تھے۔ ملا غیاث الدین مؤلف "غیاث اللغات" کے استاد اور مولوی سید حیدر علی رام پوری (خلیفہ حضرت سید احمد شہید بریلوی) کے داماد تھے ان کا انتخاب قدرت اللہ شوق کے تذکرۂ طبقات الشعراء میں موجود ہے اور اس میں یہ شعر بھی ہے

میں خاک غربت میں رل گیا ہوں برنگ اشک روانِ بیدمؔ
کسی کی آنکھوں کے شوق میں آہ جب سے چھوٹا دیار میرا

(تذکرہ طبقات الشعراء مرتبہ نثار احمد فاروقی
طبع لاہور۔ صفحہ ۵۱۳)

رام پور امروہہ سے قریب ہے ممکن ہے کہ وہاں تک یہ محاورہ پہنچ گیا ہو۔ لیکن عارف الدین خاں عاجزؔ دکن میں رہتے تھے ان کا یہ شعر خود میرؔ نے نقل کیا ہے

مینھ کے برسنے کی باؤ چلی ہے اب آنکھوں سے جان بن آنسو چلیں گے
درد کے نیساں کے گوہر غلطاں تو سی میں کنکروں سے آہ رلیں گے

(نکات الشعراء طبع اول صفحہ ۱۰۳)

اشرف علی خاں فغاں احمد شاہ بادشاہ کے دودھ شریک بھائی تھے۔ ظاہر ہے کہ قلعۂ معلیٰ میں پرورش پائی تھی۔ آزاد نے لکھا ہے کہ ان کے کمال کی سند

اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ مرزا رفیع جیسا صاحب کمال اکثر ان کے اشعار مزے لے لے کر پڑھا کرتا تھا۔ (آب حیات ۱۲۴) انھوں نے رلنا کا استعمال کیا ہے

بھویں آپس میں اس طرح رلیاں
جس طرح لڑ رہی ہوں چھپکلیاں
(دیوان فغاں مطبوعہ صفحہ ۱۶۹)

خود سودا نے بھی یہ محاورہ استعمال کیا ہے:

خاک و خوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں
اے فلک باتیں تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں
(کلیات سودا۔ مرتبہ عبدالباری آسی)

مگر یہ شعر مجموعۂ نغز (جلد ۲ صفحہ ۱۵۴) میں مجذوب کے نام سے منسوب ہوا ہے۔ یہ سودا کے متبنیٰ اور شاعری میں انھیں کے شاگرد تھے۔ ان کا یہ شعر آزاد نے بھی نقل کیا ہے (آب حیات صفحہ ۱۸۰) مگر وہاں اسے امرشے کا محاورہ نہیں بتایا۔ میر و سودا کے ایک اور ہم عصر میر ضیا دہلوی نے یوں باندھا ہے

جنّت کامت دو مژدہ مجھ خاک میں رلے کو
آرام وہاں بھی معلوم ایسے جلے بلے کو
(نکات الشعرا طبع اول صفحہ ۱۵۲)

میر شیر علی افسوس عہد میر و مرزا کے آخر میں ہوئے ہیں یہ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہونے کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے دیوان قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن ورق ۳۰۵ (حوالہ ۱۵۹/۲۵۷۵) میں ایک مرثیہ کا یہ شعر بھی ملتا ہے

تیرا لاشہ ہے جنگل میں رلتا تیرا جثہ ہے لوہو میں گلتا

زور میرا نہیں کچھ بھی چلتا میرے پیا سے مسافر حسینا

مصحفی نے رلنا (بفتح اول) کے علاوہ رلنا (بضم اول) بھی باندھا ہے
ان کا شعر ہے:

گر اس منہ سے برقع کبھی کھل گیا
تو دیکھو گے مہ خاک میں رل گیا

(ابو اللیث صدیقی: مصحفی ۱۶۴)

مگر یہ بھی بے سند نہیں ہے۔ اساتذۂ قدیم کے کلام میں اس کا استعمال بھی ملتا ہے۔ چنانچہ آصف الدولہ والیِ اودھ کی ایک رباعی ہے۔

دل آٹھ پہر تری طرف ڈھلتا ہے — تن شمع صفت غم سے پڑا گھلتا ہے
آصف سبب عشق ہے ورنہ کوئی — کوچے میں کسی کے خاک پر رلتا ہے

(کلیات آصف الدولہ قلمی نسخہ: سالار جنگ)

انہی نواب آصف الدولہ کے "بیٹے" نواب وزیر علی خاں نے اسے بالفتح باندھا ہے

جیوں سبزۂ رُندے اگتے ہی پیروں کے تلے ہم
اس گردش افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
جس گل پہ نگہ کرتے ہیں آتا ہے نظر خار
گلشن کے تلے جاتے ہیں کانٹوں میں رلے ہم

(دیوان جہاں صفحہ ۲۵۶)

غرض اس لفظ کے متعلق غالباً ہر نوع کی مثالیں فراہم ہو گئی ہیں اور ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ رلنا دو طرح (بفتح اول و بضم اول) دہلی اور لکھنؤ ہی میں نہیں بلکہ دکن تک میں رائج تھا۔ بالکسر کی کوئی سند دستیاب نہیں ہے اور مصحفی نے کہیں لکھا بھی نہیں ہے۔ یہ لفظ کسی بھی دوسرے لفظ سے مرکب ہو کر آسکتا ہے چنانچہ مذکورہ بالا مثالوں میں اتنی شکلیں ملتی ہیں

۱۔ خاک میں رلنا ۲۔ مٹی میں رلنا ۳۔ خاک وخون میں رلنا
۴۔ جنگل میں رلنا ۵۔ کانٹوں میں رلنا

مصحفی نے اس محاورے کو جتنی صورتوں میں برتا ہے سب کی سندیں دوسرے شعرار کے کلام میں مل جاتی ہیں اور اتنا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ خود آزاد ان محاوروں کے وجود سے بے خبر تھے اسلیے انھیں یہ امروہہ کی زبان معلوم ہوئی۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ آزاد کو اس موقع پر تسامح ہوا ہے۔ انھوں نے یہ تو بجا طور پر محسوس کیا کہ اس محاورہ میں کچھ اجنبیت ہے مگر اس فیصلے میں عجلت دکھائی کہ یہ امروہہ کا محاورہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ناسخ نے جن محاوروں کو منسوخ کیا تھا ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ ان کے زمانے تک "خاک میں رل جانا" بولتے تھے انھوں نے اسے متروک قرار دے کر "خاک میں مل جانا" کو فصیح بتایا۔ (صفیر بلگرامی جلوۂ خضر جلد ۱ صفحہ ۱۴۶)

ظاہر ہے کہ جو محاورہ ناسخ کے وقت میں متروک ہوا اس کا مواخذہ مصحفی سے نہیں کیا جاسکتا۔

دوسرا محاورہ "جی چلنا" تو خود آزاد کے وقت تک دہلی میں بولا جاتا تھا۔ نواب الٰہی بخش معروف کے بارے میں آزاد نے لکھا ہے کہ ان کا دیوان جو "اب رائج ہے وہ تمام وکمال انھیں (ذوق) کا اصلاح کیا ہوا ہے۔" (آب حیات صفحہ ۴۴۵) بلکہ آزاد نے اس طرح کے اشارے کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ معروف کا تو بس نام ہی ہے کلام تمام تر ذوق ہی کا ہے۔ بہرحال یہ اس بحث کا موقع نہیں۔ معروف کے مستند ہونے میں تو آزاد کو شک نہ ہوگا۔ ان کا یہ شعر ہے:

دوستو اول تو ہم کو وہ بلا سکتے نہیں

اور بلاتے بھی ہیں تو ہم جی چلا سکتے نہیں

یہ معروف کے اس دیوان میں موجود ہے جو بقول آزاد تمام و کمال ذوق کا دیکھا ہوا ہے۔ ان سے بھی پہلے حکیم ثناء اللہ خاں فراق کہہ گزرے ہیں

آنکھ اس شوخ ستم گر سے لڑا بیٹھے ہیں
بس چلے یا نہ چلے جی تو چلا بیٹھے ہیں

(تذکرہ آزردہ قلمی نور پیس کرسچن کالج لکھنؤ)
(عکس مملوکہ پروفیسر مختار الدین)

مصحفی کی زبان دانی کے ذیل میں یہ ان اعتراضات کی تحقیق تھی جو محمد حسین آزاد نے آب حیات میں پیش کیے تھے۔ اس مضمون کی دوسری قسط میں دوسرے معترضین کے اعتراضات سے بحث کی جائے گی (۱۹۵۹)

دیوان قصائد مصحفی

کتب خانہ رام پور میں مصحفی کے دیوان قصائد کا جو خطی نسخہ ہے[1] وہ معمولی نستعلیق میں کشمیری کاغذ پہ لکھا گیا ہے۔ یہ قدرے کرم خوردہ بھی ہے۔ اس میں ۱۳۱ اوراق ہیں، عنوانات شنگرفی ہیں۔ قصائد کی مجموعی تعداد (۶۹) انہتر ہے۔ اسی کتب خانے میں دیوان چہارم کے نام سے ایک اور قلمی نسخے کا اندراج ہے[2] یہ (۴۹) اوراق پر مشتمل ہے۔ اس میں قصائد کے ساتھ قطعات و غزلیات بھی ہیں۔ قصائد و قطعات کی تعداد (۱۶) ہے۔ ظاہرًا یہ نسخہ مصنف کی زندگی میں نقل ہوا ہے کیوں کہ رباعیات کے آغاز میں یہ عبارت ملتی ہے "شروعات رباعیات من تصنیف میر مصحفی سلمہٗ اللہ تعالیٰ۔" ان کے علاوہ کلیات مصحفی کے نسخہ لاہور میں بھی قصائد کے تین دواوین ہیں، جن کے قصائد کی تعداد ۴۸ بتائی گئی

---

[1] شاعر: بمبئی (فروری ۱۹۶۱ء) میں قاضی عبدالودود صاحب نے اس خطی نسخے کی تفصیلات پیش کی ہیں، یہ چوں کہ "نسخہ رام پور کی نقل" پر مبنی ہیں اس لیے اغلاط کتابت بھی اس میں درج ہو گئی ہیں۔ قاضی صاحب کے قول کے مطابق "اشعار کی مجموعی تعداد ۳۹۷ ہے۔" [2] رضا لائبریری، رامپور، فہرست اردو مخطوطات، نمبر ۴۴۹ نمبر درآمد ۱۰۹۰۔

ہے۔[1] یہ نسخہ فی الحال میری دسترس سے باہر ہے۔ میں نے اس کی تفصیل ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتاب "مصحفی اور ان کا کلام" سے اخذ کی ہے۔

حال ہی میں مجھے دیوان قصائد مصحفی کا ایک اور قیمتی نسخہ مطالعہ کے لیے ملا[2] جو مصحفی کی زندگی ہی میں نقل ہوا ہے۔ اور دوسرے نسخوں کے مقابلے میں جو میری نظر سے گزرے ہیں، زیادہ مکمل ہے۔ اس کے آخر میں ترقیمہ کی عبارت یہ ہے :-

"تمام شد نسخۂ قصائدات (کذا) میاں مصحفی صاحب دام افضالہٗ حسب الفرمائیش (کذا) نواب صاحب بالاقدار آغا اصغر علی خاں بہادر دام اقبالہٗ بخط بدنمط عاصی امید علی عفی اللہ عنہ، بتاریخ بست و ششم شہر جمادی الاول ۱۲۳۹ھ ہجری یوم چہار شنبہ بوقت یک پاس روز برآمدہ باتمام رسید۔ بموجب ۱۸۲۳ء عیسوی بموجب ۱۲۳۱ فصلی موافق سنبت ۱۸۸۰ بکرماجی"

یہاں اس نسخے کے مشمولات درج کرتا ہوں۔ اختلافات کی نشاندہی حواشی میں کردی گئی ہے۔ اس میں قصائد کی مجموعی تعداد (۸۶) ہے اور کل اشعار کی تعداد (۴۸۰۴) چار ہزار آٹھ سو چار ہوتی ہے۔

۱۔ حمد باری عز اسمہٗ (تعداد اشعار ۶۱)[3]

قابل حمد و ثنا ہے وہ خداوند کریم ۔۔۔ جس نے انساں کے تئیں طرز سخن کی تعلیم[4]

---

[1] بحوالہ قاضی عبدالودود: دیوان قصائد مصحفی، شاعر بمبئی فروری ۱۹۶۱ء۔ [2] یہ نسخہ جناب عاصم کاظمی امروہوی کا ہے، میں ان کا شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اس سے استفادے کا موقع دیا۔
[3] نسخۂ رامپور و نسخۂ ب میں اس کا عنوان "قصیدہ در مناجات حضرت باری" ہے۔ [4] مگر اس قصیدے کے ایک شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک مصحفی کے چھ دیوان مکمل ہو چکے تھے :
مرے دیوان چھوؤں اس کے ہیں مانند سبیل ۔۔۔ بزم شاہاں میں لباس ان کا ہے جلد ادیم

۲۔ نعت سید المرسلین (تعداد اشعار ۵۲)

بعضوں کو یہ گماں ہے کہ ہم اہلِ زباں ہیں ۔۔۔ دلی نہیں دیکھی ہے زباں داں یہ کہاں ہیں[1]

۳۔ ایضاً (اشعار ۶۱)[2]:

جو ہاتھ آتا مرے یکسر گریباں، آستیں، دامن ۔۔۔ تو تھا سو چاک کے در خورِ گریباں آستیں دامن

۴۔ ایضاً (اشعار ۵۶):

حنا سے ہے یہ تری آخ اے نگار انگشت ۔۔۔ کہ ہو نہ پنجۂ مژگاں کی ریتہار انگشت

۵۔ قصیدۂ نعتیہ (اشعار ۳۲)[3]:

پرکار وار دور کیے اس نے یوں ہزار ۔۔۔ اپنی مراد پر نہ پھرا چرخ ہرزہ کار

اس قصیدے میں یہ اشعار قابلِ توجہ ہیں:

اصحاب اس کے چار ستون قصرِ دیں کے ہیں ۔۔۔ بارہ دری ہے جن سے امامت کی استوار

نے اہلِ رفض سے ہے مجھے رفض اس قدر ۔۔۔ نے شیعیانِ دیں سے میں رکھتا ہوں ننگ و عار

آزاد ہوں مناظرہ روز و شب سے میں ۔۔۔ میں سب کا دوست رکھتا ہوں اک سب پہ اعتبار

گر سنی کوئی سمجھے مجھے اس کا غم نہیں ۔۔۔ کس واسطے کہ تھے یہی میرے بزرگوار

میں شیعہ اک ہوا، تو ہوئی کیا مفاخرت ۔۔۔ ہونا پڑے ہے یوں بھی تو مطعونِ روزگار

القصہ اس سے کام ہے کیا، ہوں محمدی ۔۔۔ آگے جو کچھ کہ چاہے کرے لطفِ کردگار

---

[1] ب میں تعداد اشعار ۵۳۔ عنوان: قصیدہ در مدح محبوب کبریا حضرت محمد مصطفیٰ صلعم۔ اسی قصیدے کے ایک شعر میں پرواہ نظم ہوا ہے:

پرواہ انھیں کہاں ہے ردیف اور روی کی ۔۔۔ کب قافیے کی قید میں آتش نفساں ہیں

[2] ب میں تعداد اشعار ۶۵ درشاعر میں ۶۳ بتائی گئی ہے، اس کا احتمال ہے کہ مجھ سے شمار میں غلطی ہو گئی ہو۔ میری یاد داشت میں (۶۵) ہی لکھا ہوا ہے۔

[3] نسخۂ عاصم (= الف) میں عنوان نہیں ہے، لیکن گریز کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نعت میں ہے۔ یہ قصیدہ ب میں نہیں ہے۔

۶۔ منقبت حضرت امیر (اشعار ۴۷)[1]:

طے کر چکی ہے گیا یہ رہِ انتظار چشم — پھڑکے ہے میری آج جو بے اختیار چشم

۷۔ ایضاً (اشعار ۳۶):

صورت میں آپ ہاچرخ مدوّر بنا گرہ — کھولے کسی کے کام سے کیوں کر بھلا گرہ

۸۔ ایضاً (اشعار ۲۶)

ہووے اس شخص سے کیا معنی رنگیں کی تلاش — خونِ دل سے ہی سدا جس کی رہے وجہِ معاش

۹۔ ایضاً (اشعار ۵۰):

گرمی سے مستفیض ہوا عکس آفتاب — کیا ہے عجب جو بحر میں ماہی بنے کباب[2]

۱۰۔ ایضاً (اشعار ۳۲):

دَبا ہے جب سے کہ میرا یہ قصر ہشیاری[3] — کرے ہے پیرِ خرد روز عرض معماری

۱۱۔ ایضاً (اشعار ۶۱):

ہو چکا دور میر اور مرزا — اب زمانے میں دور ہے میرا
درد کو شاعروں میں کیا گنیے — کیوں کہ ہے دور خواجہ کا رتبا

---

[1] ب میں تعداد اشعار ۴۶، اور مطلع یہ ہے:

تھی بسکہ ہر خواب عدم بے قرار چشم — کھلتے ہی بندگی مری مثل شرار چشم

یہ ب میں قصیدہ نمبر ۴ ہے اور نامکمل بھی ہے۔

[2] یہ ملحوظ رہے کہ اشعار نقل کرنے میں قیاسی تصحیح سے کام لیا گیا ہے، لیکن ہر جگہ اس کی نشان دہی نہیں کی گئی۔

[3] ب میں "گرا ہے جب سے" الخ۔

[4] [illegible] ''میری یادداشت میں نسخہ ب کے اس قصیدے کی تعداد اشعار ۶۲ لکھی ہے۔ کرتانی صاحب نے شاعر میں ۶۱ ہی بتائی ہے۔ اس قصیدے کے جو اشعار اوپر نقل کیے گئے ان میں نسخہ ب سے بہت اختلاف ہے۔ (باقی صفحہ ۸۷ پر)

ہیں وہ بالا نشینِ مسندِ فقر ‏— ان کا کب اس طرف خیال رہا
بس وہی عالمِ جوانی میں ‏— بیش و کم ریختہ کہا سو کہا
فقر میں نعرا انھوں نے مارا تھا ‏— نقشبندیہ تھا مقام ان کا
اک مشائخ سے دینی نسبتِ شعر ‏— اپنے نزدیک ہے یہ پُر عجب
اس سے میری غرض ہے یہ کہ فلاں ‏— تو تو ہے اعتبار کا پیدا
شاعری کی نہیں تو کیا جانے ‏— تو نے رنجِ سخن نہیں دیکھا
پوچھ مجھ سے کہ میں نے اپنی عمر ‏— دی ہے سب فن شاعری میں گنوا
دلّی کے سب مشاعرے دیکھے ‏— اور ہم طرح میر کا میں رہا
بلکہ جب سب سے اٹھ گئی ہمت ‏— اپنے ہاں بھی مشاعرہ میں کیا
مجھ سے دبتے رہے بڑے چھوٹے ‏— میں کسی سے وہاں کبھی نہ دبا
گرچہ سب کی زباں تھی تیغ تیز ‏— لیک منہ پر مرے کوئی نہ چڑھا

۱۲۔ ایضاً (اشعار ۵۰):

گر فیضِ سخن ہو چمن آرائے طبیعت ‏— تو گل کو دکھا دوں میں تماشائے طبیعت

۱۳۔ ایضاً (اشعار ۸۵):

روز نوروز کرے کیوں نہ دلوں کو صیقل ‏— عکس خورشید سے ہے روکشِ آئینہ عمل

(حاشیہ بقیہ صفحہ ۸۶) نسخۂ ب کے یہ اشعار الف سے غیر حاضر ہیں:

درد کو شاعروں میں سمجھوں میں ‏— یہ تو ہونا نہیں ہے داد روا ؟
کیوں نہ دلّی کے بیچ گزرے ہیں ‏— ڈھائی شاعر سر آمدِ شعرا
اس کی تفصیل یہ کہ کہتے ہیں ‏— میر و مرزا دو اور درد آدھا
یہ مسلّم کہ ہے فصیح و بلیغ ‏— جو کچھ اس نے غزل کی قسم کہا
لیک اب جو نا تمام ہوئے ہے اسے ‏— شاعروں میں کیوں پورا گنا
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ ب پہلے لکھا گیا ہوگا بعد میں مصحفی نے یہ اشعار تبدیل کر دیے اور ان کا آخری صورت وہ ہے جو الف میں ملتی ہے۔

۱۴- ایضاً (اشعار ۵۱)[1]:

بترہ روزی سے مری کیوں کہ نہ ہو شاد آتش شب کو آتی ہے نظر جیسے پری زاد آتش

۱۵- مدح امام حسن[2] (اشعار ۷۰):

زبس تھی الفت زنّار بنداں دل میں پنہانی گرے آنکھوں سے آنسو بن کے تسبیح سلیمانی

اسی قصیدے میں یہ اشعار فخریہ شامل ہیں:

بھلا میرے مرقع کا بھی عالم اک ذرا دیکھو اگر ہے ہاتھ میں سودا کے یارو خامۂ مانی

قصائد میں مرے اور اس کے چنداں فرق تو کیا ہے میں عرفی ہی سہی اس فن کا گر گزرا وہ خاقانی

۱۶- مدح حضرت امام حسین (اشعار ۴۷):

خاک چمن نے رنگ نکالا ہے اب کی سال پھولوں کی ڈالیاں نظر آتی ہیں لال لال

۱۷- درمدح حضرت زین العابدین (اشعار ۴۵):

تھی بسکہ بہر خواب عدم بے قرار چشم کھلتے ہی مند گئی مری مثل شرار چشم

۱۸- درمدح حضرت علی اکبر[3] (اشعار ۴۰)

ہے یاں قلم فکر کی جا گیر ہوا پر کیوں کر نہ ہو حاصل اسے توقیر ہوا پر

۱۹- منقبت جناب مرتضوی (اشعار ۷۰)[4]

ہے مثل سلیماں مری تسخیر ہوا پر مرزا جا اڑے اور نہ یہاں میر ہوا پر

آتش نفسی دیکھ مری وہ بھی ہوا سرد قائم کی جو تھی حدت تقریر ہوا پر

اور میر حسن سحر بیاں تھا جو غزل میں اس کا بھی یہاں چل نہ سکا تیر ہوا پر

پر اس کا میں شاہد ہوں کہ ہاں کھینچ گیا ہے پہلے وہی اس نقش کی تصویر ہوا پر

---

[1] نسخہ ب میں تعداد اشعار ۵۲۔
[2] نسخہ ب سے غیر حاضر۔
[3] ب سے غیر حاضر۔
[4] ب سے غیر حاضر۔

بعد اس کے غزل لکھی ہے یارانِ دگر نے — گو نام کوئی مرزا کی تشہیر ہوا پر[1]

۲۰۔ مدح پیر فخرالدین محمد[2] (اشعار ۲۴):

ستاروں سے زبس سقف فلک ساری مجدر ہے — بہار کہکشاں رشک دم طاؤس خوشپر ہے
وہ حضرت کون ہیں بتلاؤں مجھ پیر و مرشد ہیں — کہ جن کے فیض سے میرا چراغِ دل منوّر ہے
نظام الدینؒ کا ان کو سلسلہ پہنچے ہے اس باعث — نظام خاندان چشت ان سے معتبر تر ہے
گر ان کا جاذبہ پہنچائے جیتا مجھ کو دلی میں — تو اپنی آرزو بھی ہے یہی کیوں مرگ سر پر ہے
پس اس سے ہے یہی بہتر کہ مشت استخواں اپنے — فراق دلی سے رنج و تعب دن رات جن پر ہے
گر اس خاک معطّر میں ہوں مدفون تو تو ہر ساعت — سمجھیے یہ کہ خاک پاک دلی روح پرور ہے
شرف رکھتی ہے واں کی موت یاروں یاں کے جینے پر — یہی جینا ہے تو جینے سے ایسے موت بہتر ہے

۲۱۔ در مدح صاحب عالم جہاندار شاہ (اشعار ۳۴)[3]

بر سر خلق خدا پرتو نور اللہ — صاحب عالم لقب تو ہے جہاندار شاہ

۲۲۔ ایضاً (اشعار ۸۷)[4]:

---

[1] مصحفی نے یقین کے بارے میں لکھا ہے: "در دورۂ ایہام گویاں اوّل کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ این جوان بود، بعد ازاں بتتبعش بدیگراں رسیدہ" (تذکرہ ہندی/۲۷۵) اور یہی رائے کا اظہار میرزا مظہر کے بارے میں بھی کیا ہے (تذکرہ ہندی/۲۰۳)

[2] ب میں عنوان: "قصیدہ در مدح مولوی فخرالدین صاحب مرشد میاں مصحفی" یہ سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے مشہور بزرگ گزرے ہیں۔ (حالات کے لیے ملاحظہ ہو: تکملۂ سیرالاولیاء مولفہ گل محمد احمد پوری (۱۳۱۲ھ) اور فخرالطالبین مرتبہ درد کاکوروی۔ طبع کراچی۔

[3] ب میں عنوان: مدح بادشاہ زادہ مرزا جواں بخت۔ تعداد اشعار ۳۲۔

[4] ب میں عنوان: در مدح شاہزادہ عالمیاں مرزا سلیمان شکوہ بہادر۔ تعداد اشعار ۸۷۔ مگر قاضی صاحب نے شاعر میں تعداد اشعار ۸۵ بتائی ہے۔

آیا ہے کیا چمن میں مگر تاجر بہار — کھولے ہیں ہر طرف کو جو غنچوں نے اپنے بار

٢٣۔ در مدح وزیر آصف الدولہ[1] (اشعار ٨٠):

ہوا ہوں بس کہ میں دورِ فلک سے سرگرداں — کہ خاک بھی مری جوں گردباد ہے پیچاں

٢٤۔ ایضاً (اشعار ١١٨):

فلک کیوں نہ ہم کو کرے تیرباراں — زمیں ہے نشانہ، ستارے ہیں پیکاں

٢٥۔ ایضاً[2] (اشعار ٤٤)

منہ سے برقع کو مری جاں تو اگر دیوے کھول — تجھ سے خوبانِ عرب ناز و ادا لیویں مول

٢٦۔ ایضاً (اشعار ٩٤)[3]:

جب سے سرطاں میں ہوا نیرِ اعظم کا عمل — جس طرف دیکھیے پانی سے بھرے ہیں جل تھل

٢٧۔ مدح میرزا سیف علی خلف نواب وزیر (اشعار ٦١)[4]:

ہاتھ ہر سفلہ کا پہنچے تا بدامانِ قلم — چاک ہے اس غم سے جیب دیکھو گریبانِ قلم

٢٨۔ در مدح میر نعیم خاں ثابت جنگ (اشعار ٤٧):

میں ایک دن گیا جو پئے سیرِ بوستاں — دیکھا چمن میں میں نے عجب طرح کا سماں

٢٩۔ ایضاً (اشعار ٤٩):

ہے بنا چہرہ ترا جیسے کہ تصویرِ فرنگ — دیکھ کر کیوں نہ تجھے عالمِ تصویر ہو دنگ

٣٠۔ قصیدہ در مدح نواب حسن رضا خاں (اشعار ٥٦)[5]:

ان دنوں کیا کہیے ہم سے کیا گنہ سرزد ہوا — لے وہ آنکھیں پیار کی نے وہ نگاہِ آشنا

٣١۔ قصیدہ در مدح نواب طاہر الدولہ عرف محمد رضا خاں خلف الرشید نواب حسن رضا خاں (اشعار ٤٦)[6]:

---

[1] نسخہ ب کی میری یادداشت میں تعداد اشعار ٥٢۔ [2] ب میں تعداد ٤٥۔ [3] ب میں تعداد ١٥٠۔ [4] نسخہ ب کی میری یادداشت میں تعداد ٦١ شاید سہو ہے ٦٢۔ [5] ب میں تعداد ٥٥۔

[6] ب میں عنوان نہیں ہے لیکن گریز میں نام آیا ہے (طاہر الدولہ بہادر وہ کہ جس کا دست جود) کاتب کی غلطی سے ب میں عنوان غلط جگہ لکھا گیا ہے جس سے ایک قصیدے کے دو معلوم ہوتے ہیں۔

دم میں دم ہے جب تلک لازم ہے ہم کو پیچ تاب　　موج سے پہلو تہی ٹوٹے سے کرتا ہے حباب

۳۲۔ قصیدہ درمدح نواب بارگاہ قلی خاں دستور المعظم میرزا جواں بخت جہاندار شاہ (اشعار ۳۱):

دل ہجا میں اپنے سیر جہاں کر رہے ہیں ہم　　کافر ہو جس کو ہو دسے تمنائے جام جم

۳۳۔ قصیدہ درمدح نواب محبت خاں[1] (اشعار ۹۰):

الفت چسپاں تھی میرے خون کو خنجر کے ساتھ　　رہ گیا ہے وصل ہو کر تب تو ہر جوہر کے ساتھ
حافظ الملک اس کا والد وہ شہید نامدار　　معرکہ میں آیا تھا جو لاؤ لشکر کے ساتھ
ہے ثبات اس کے سے یہ ظاہر کہ اس کی ذات کو　　دیجیے گر نسبت تو کچھ نسبت نہیں اکبر کے ساتھ

۳۴۔ قصیدہ درمدح زین العابدین خاں عرف میرزا مینڈھو خلف نواب سالار جنگ (اشعار ۱۴۱[2])

گیا اک دن جو میں طرف گلستاں　　سنی کس کس روش سے صوت مرغاں

۳۵۔ قصیدہ (مسمیٰ بہ "تیغ براں")، در ذکر حال خود و آمدن از دہلی در لکھنؤ و رفتن در مشاعرہ رضا قلی (اشعار ۱۴):

ہے شکایت مجھے یاروں سے کہ ہیں دشمن جاں　　ان کے ہاتھوں سے نہیں ملتی کسی طرح اماں[3]

۳۶۔ قصیدہ در مدح سیدی مہدی بسفارش میرزا قتیل کہ معشوق او بود[4] (اشعار ۴۷)

جشن نوروز سے ہے بس کہ جہاں رشک نگار　　جس طرف دیکھیے واں جلوہ گری میں ہے بہار

---

[1] نسخہ ب، کی میری یادداشت میں ۹۱ اشعار ہیں شاعر میں ۹۰۔

[2] ب کے عنوان میں زین العابدین، تعداد اشعار ۱۴۲، مگر شاعر میں ۱۴۱۔

[3] یہ قصیدہ نسخہ لاہور سے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی کتاب "مصحفی اور ان کا کلام" میں نقل ہوا ہے۔

[4] ب میں تعداد اشعار یہی ہے مگر شاعر میں (۹۰) لکھی گئی ہے یہ سہو قلم معلوم ہوتا ہے۔ نسخہ ب کے عنوان میں "بسفارش" کے بعد کی عبارت نہیں ہے۔

۳۷۔ قصیدہ در مدح میرزا جعفر ہمشیرزادہ نواب نجف خاں (۴۳)

مجھ کو گویائی سے اے یار ہو رہا کیا سروکار　　　کہ میں حیران تو ہوں صورتِ نقشِ دیوار

۳۸۔ قصیدہ شہر آشوب دہلی (اشعار: ۵)[1]

یہ گورے بے نہیداں، بے زباں اور بے بیاں ہیں　　　دعویٰ ہو جسے شعر کا آوے نہ کہاں ہے

۳۹۔ قصیدہ در مدح صاحب عالم سلیمان شکوہ[2] (اشعار: ۹):

ہے جوشِ نامیہ اب کی ہوا ہے فصلِ بہار　　　کہ دانہ ہووے ہر اک مرغ کے تہِ منقار

۴۰۔ ایضاً (اشعار ۸۲):

گر بازِ معانی کا مرے ہووے ہوا گیر　　　پیدا کریں احرار ہوا حکم عصا فیسر

۴۱۔ ایضاً (اشعار ۵۴):

علم کیے ہوئے ہے ترکِ آسماں شمشیر　　　ہے اس کے ہاتھ میں بے مدّ کہکشاں شمشیر

۴۲۔ ایضاً (اشعار ۵۰):

خورشید نہ وحسن مہ تاباں کے برابر　　　ہو کیوں کہ ہلال اس کے گریباں کے برابر

۴۳۔ ایضاً (اشعار ۲۹)[3]:

ہوں گے آپس میں پرد زا درچہ شب سیاہ گھوڑی ایک　　　بنتی رکھتے ہیں اب اے ماہ طلعت گھوڑی ایک

۴۴۔ ایضاً (اشعار ۶۲)[4]:

تکتا ہیں اس کے پلے میں ہوتا گر انوری　　　مرزا و میر سے مجھے کیا ہے برابری

۴۵۔ ایضاً (اشعار ۸۰):

یہ عکس ماہ سے ہے چہرۂ زمیں پُر نور　　　کہ شکل جادہ ہے صحرا میں رشکِ ساعدِ حور

---

[1] ب میں تعداد اشعار ۱۵۔ اس کے اشعار "مصحفی" از ابو اللیث میں نقل ہوئے ہیں۔

[2] ب میں اشعار ۹۱۔

[3] ب میں اشعار ۳۰۔

[4] ب میں اشعار ۶۱۔

۴۶- در مدح اسپ کہ یار وفادار نام داشت (اشعار ۲۷)[۱]

ہم ماہِ سریع ہے ترا سُم — ہم زلف طویل ہے تری دم

۴۷- "ایں قطعہ نسبت بانشاء اللہ خاں" (اشعار ۲۵):

اے آں کہ معارض ہو مری تیغ زباں سے — تو نے سپرِ عذر میں مستور کی گردن[۲]

۴۸- قطعہ (اشعار ۱۸)[۳]

اے سلیمانِ جم شکوہ کہ ہے — نام تیرا بخسروی مشہور

۴۹- در مدح صاحب عالم (اشعار ۴۲)[۴]

کرے نہ کیوں کہ زمیں رشکِ گلستاں نوروز — کہ ہے بہار ربیعی سے گلفشاں نوروز

۵۰- در مدح سلیمان شکوہ (اشعار ۳۳): (بتقریب عید قرباں)

کون ہوں میں خدایگانِ سخن — ہے مرے حکم میں جہانِ سخن

۵۱- در مدح صاحب عالم قصیدہ ناتمام[۵] (اشعار ۱۸)

---

[۱] ب میں تعداد اشعار ۲۸۔ شاعر میں قاضی صاحب نے اس کے عنوان کی جگہ ایضاً لکھا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سلیمان شکوہ کی مدح میں ہے مگر قصیدے میں ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

[۲] یہ آبِ حیات میں نقل ہوا ہے۔ اور مصحفی کے دیوان سوم میں بھی پایا جاتا ہے۔ قاضی صاحب کی اطلاع کے مطابق دیوان سوم میں دو شعر زیادہ ہیں۔ شاعر میں اس کا عنوان بھی "ایضاً" ہے جس سے یہ سلیمان شکوہ کی طرف منسوب ہو جاتا ہے۔ مگر الف میں انشا کا نام ہے۔

[۳] یہ قطعہ ہے اور ب کے عنوان میں بھی یہی لکھا ہوا ہے، یہ سلیمان شکوہ سے شال دوشالہ طلب کرنے کے لیے لکھا گیا تھا۔ [۴] نسخہ ب کی میری یادداشت میں تعداد اشعار ۴۱۔ شاعر میں ۴۰۔

[۵] الف کا عنوان یہی ہے۔ شاعر میں "خطاب بہ سلیمان شکوہ" اور یہی قرین صحت ہے۔

خطائے خصم نہیں کچھ یہ بخت کا ہے قصور — کہ مجھ سے طور نخستیں نہیں مزاج حضور

۵۲۔ (خطاب بہ سلیمان شکوہ درمعذرت اتہام انشاؔ) (اشعار ۱۴)[1]:

قسم بذات خدائے کہ ہے سمیع و بصیر — کہ مجھ سے حضرت شہ میں نہیں ہوئی تقصیر[2]

۵۳۔ مدح آصف الدولہ (اشعار ۵۰)[3]

عجب طرح کا دلانے کا ہے یہ لیل و نہار — کہ روز روشن آنکھوں میں اپنے ہے شب تار (کذا)

ہنستے نہ کیوں کہ بھلا مجھ چرخ بعت باز — بنا کے خصم جو گدا مرا کرے طیار

دمے کے ڈگڈگی ہو مہر و مہ کے سر چسپاں — نچاوے بوزنہ پھر کیوں نہ چرخ بوزنہ کار

کروں جو شعر غزل میں تو ہجو حاسد کی — وہ میری ہجو کرے اس طرح سر بازار

دگر جواب دہی کا ادھر سے ساماں ہو — تو یہ ڈرائے کہ ہے شاہزادے کا دربار

۵۴۔ مدح خیالی رام (اشعار ۲۵):

نگاہ کر کہ بوقت غروب بر سر شام — کرے ہے تیرہ رخ مہر، گردش ایام

۵۵۔ ایضاً (اشعار ۶۲)[4]

رنگ طرب ہو کیوں نہ رخ گل سے آشکار — موسم کی ابتدا ہے یہ اور آمد بہار

۵۶۔ ایضاً (اشعار ۳۵):

ہے لعل اشک کا جو مرے سنگ رنگ ڈھنگ — رکھتا ہے کب وہ ہر گل اور نگ نگ ڈھنگ

۵۷۔ ایضاً (اشعار ۶۶):

غمزہ سفاک فتنہ گر چتون — تسپہ آفت ادائے چشم زدن

---

[1] الف میں اس کا کوئی عنوان درج نہیں۔ [2] یہ قطعہ آب حیات میں نقل ہو چکا ہے مگر شعر ذیل اس میں نہیں ملتا (شعر ۴):

سو وہ بھی ہو چکی، یعنی بصورت انواع — گلی گلی تو ہوئی سارے شہر میں تشہیر

[3] ب میں ۴۹ اشعار، اس قصیدے میں انشا کی شکایت کی گئی ہے۔

[4] نسخہ ب کی میری یادداشت میں تعداد اشعار ۶۳۔ شاعر میں ۶۲۔

۵۸۔ قصیدہ در مدح جناب مرتضوی (اشعار ۴۴)[1]:

روز و شب مل کے اگر ہو دیں بہم دونوں ایک
رخ و گیسو کی ترے کھادیں قسم دونوں ایک

مصحفی کو کوئی جرأت سے جدا مت جانو
ہیں فن شعر میں البتہ یہ ہم دونوں ایک

اور طبیعت کی بھی آپس میں یہ سنجش ہے صریح
جیسے پلڑے ہوں ترازو کے بہم دونوں ایک

ان کی شہرت کا ہے پامال حسد اک عالم
اہل کاوش سے اٹھاتے ہیں ستم دونوں ایک

۵۹۔ مدح میرزا علی حسن خلف نواب سالار جنگ[2] (اشعار ۵۸):

تھا ایک ان میں کلبہ احزاں میں بے قرار
جور و جفائے چرخ سے شاکی روزگار

۶۰۔ مدح نواب آصف الدولہ بطور جلال اسیر گفتہ شد[3] (اشعار ۲۶):

نہ خال کا ہوں میں قیدی نہ زلف کا ہوں اسیر
پڑا ہے آن کے ششدر میں مہرۂ تدبیر

۶۱۔ میرزا علی حسن (اشعار ۴۵)[4]:

ڈ پٹوں اگر میں رخش طبیعت کو وقت جنگ
ہو جاوے قیس پر بھی فصاحت کا عرصہ تنگ

۶۲۔ مدح ٹیکا رام تسلی (اشعار ۵۰):

اگرچہ مجھ کو قصیدے سے کچھ رہا نہیں کام
ولے ضرور ہے اب مدح لالہ ٹیکا رام

۶۳۔ قصیدہ نسبت بہ چند شخص گفتہ شد (اشعار ۷۰)[5]:

ہے اس زمانے میں ایسا کوئی تو لغوی خام
کہ کہہ کے ذم کے سخن ضم کرے ہے میرے نام

سو نسبت ان کی جو ہیں سلسلے میں سودا کے
غریب و خانہ نشین و مہذب الاقلام

بس اتنے واسطے تا ہو کے وے بر آشفتہ
جو جی میں آوے مرے حق میں کچھ کریں اتہام

غرض یہ طرفہ تماشا ہے آپ ہو رد پوش
بخار دل سے نکالے ہے یوں وہ نافرجام

ولے میں ان کی کبھی فہمید کا ہوں دیوانہ
اگر وہ سمجھیں بھلا ہے مری یہ طرز کلام

---

[1] ب میں تعداد اشعار ۵۲۔ [2] ب میں تعداد اشعار ۶۰۔ [3] اس کے کچھ اشعار شاعر میں نقل ہوئے ہیں۔ [4] ب میں ۴۵۔ اشعار، مگر شاعر میں تعداد ۴۳ بتائی گئی ہے۔
[5] نسخہ ب کی میری یادداشت میں ۶۹۔ شاعر میں ۷۰۔

جو لوگ آج ہیں قائم مقام مرزا کے
کروں گا ہجو میں ناحق انھوں کی نام بنام

خدانخواستہ کچھ سر نہیں پھرا میرا
مگر جو چاہے کرلے یوں یہ گردشِ ایّام

کہ دوست اپنے جو ہوں وہ بھی پھر نہیں دشمن
یہی تو چاہے ہے البتہ آسماں کی خرام

مرے شفیق ہیں اوّل جو میرزا احسن[1]
کمال ساتھ متانت کے ہے انھوں کا کلام

پھر ان کے بعد محمد رضا نے اردو داں
ہے میرے سامنے مربوط ان کا پختہ و خام

مسوم وہ سیّد پاکیزہ میر فخر الدین
کہ تھے ہمیشہ وہ مرزا کے کاتبِ الہام

رفیع ہے یہ کلام ان کا فیض مرزا سے
کہ آفتاب کے پہلو میں جوں ہو ماہ تمام

تخلص ان کا ہے ماہر ہیں صاحبِ اصلاح
ہنسوڑ گو انھیں کشمیر کا کہیں حجّام

میں ان کو جانتا ہوں اپنا کعبہ و قبلہ
رکھوں گا ان کی میں ریشِ سپید پر کچھ نام

لکھے ہے خاکہ معنی کو وا در صورت سے
کبھی سنوں ہوں مصوّر کا شاعری ہے کام

سبب کچھ ان کے بگڑنے کا پر نہیں کھلتا
اگر یہی ہے کہ فخریہ کیوں ہے اس کا کلام

تو ٹک قصائدِ عرفی کی جا کے سیر کریں
کہ اس میں فخریہ از ابتدا ہے تا انجام

مقام لاف میں آ کے اس نے بھی بکمال
رکھا ہے لوالفرج والوری پہ کیا کیا نام

چلا جو چال قصیدے کی میں بھی کیا ہے گناہ
اسی طرح سے ہیں تشبیب کی کئی اقسام

غضب تو یہ ہے کہ سودا بھی اپنا فخر یہ
سر قصیدہ میں دعوے سے کر گیا ارقام

سمجھے یہ نہیں ایراد اس پہ ہے اوّل
کہ اس کلام پہ بندہ ہے مَوردِ الزام

میں گوشہ گیر ہوں مدت سے پر یہ قہر سنو
کہ کب گیا ہے کبھی گرم اس طرف ناکام

"لکھیں ہیں ہجو میاں مصحفی بہم یہ لوگ"
دیا ہے بس یہی شاہ کمال نے پیغام[2]

---

[1] یہ وہی احسن شاگرد سودا ہیں جن کا کہا ہوا طویل قصیدۂ رائیہ کلیات سودا میں شامل ہے جو مصحفی کی ہجو سودا کے جواب میں لکھا گیا تھا۔

[2] شاہ محمد کمال، کمال تخلص (شاگرد قائم چاندپوری و تلمیذ بخش جرأت

(باقی ص ۹۷ پر)

پر اب تلک تو نہ بھیجا کسی نے اک پرزا
مری بلا سے لکھا یوں اگر قصیدہ تمام

یہ وہ مثل ہے کہ جس طرح دوسے رویا
فغاں کرے پہ نہ آوے مقابل عزعام

سو کب میں شورش بے جا سے ان کی ڈرتا ہوں
انھوں کی ہجو کو اک گرم بس ہے اور یہ تمام

میں اپنی شان میں عنقا ہوں قافِ معنی کا
یہ پہنچے مجھ تئیں کب ہے بلند میرا مقام

نہیں یہ ہجو کے قابل پر ان کی خدمت کو
جو یوں بھی چاہیں تو کافی ہیں بس مرے خدام

اگرچہ سب ہیں تو لخواں ولیکن ان میں سے
بلا ہیں خنجر و گرم جوش برہنہ حسام

انھوں کی نظم کو سنتا جو سوزنی گا ہے
تو ہوتا دیدۂ سوزن وش اس پہ خوابِ حرام

جو مجد ہمگر انھوں کے زمانے میں ہوتا
تو دیتے سعدی کی جانب سے اس کو یہ الزام

بریہہ گو ہیں یہ ایسے فواحشات کے بیچ
کرے کلام سے فوقی کے فوق ان کا کلام

اگر وہ تالیاں لڑکوں سے ان پہ بجوا دیں
ستارے جگنو کے مانند جا دیں چھپ سرِ شام

ضلع جو بولنے والے ہیں بحرِ و ماہی کے
کریں ہیں ہو کے وہ خم مثل موج ان کو سلام

بزرگ زادگی میں ان کی شک نہیں لیکن
کرے ہے آن سے سفیہِ فلک زالت وام

۶۴- مدح خیالی رام (اشعار ۵):

یہ کس کی چشم سے سیکھ آئی ہے حیا نرگس
کہ چشم دوختہ ہے سوئے پشت پا نرگس

۶۵- صفدر علی خاں (اشعار ۵):

بس کہ اس فصل میں ہوتے ہیں ہرے عظم رمیم
روکش بادِ مسیحا ہے گلستاں میں نسیم

حاشیہ بقیہ صفحہ ۹۶- مراد ہیں جو کڑا مانک پور کے رہنے والے تھے۔ یہ ۱۲۱۵ھ تک لکھنؤ میں تھے۔ ۱۲۱۵ھ کے اواخر یا ۱۲۱۶ھ کے اوائل میں حیدرآباد چلے آتے تھے۔ ان کا دیوان رام پور اور حیدرآباد میں موجود ہے۔ ایک ضخیم تذکرہ مجمع الانتخاب بھی مرتب کیا تھا اس کا ایک ناقص نسخہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند)، نئی دہلی میں ایک مکمل نسخہ سالار جنگ لائبریری حیدرآباد میں محفوظ ہے۔ میں نے اس تذکرے کی تلخیص مقدمہ و حواشی کے ساتھ تیار کی ہے جو میری کتاب "تین تذکرے" میں شامل ہے۔

۶۶۔ میرزا محمد تقی ہوس (اشعار ۴۷[1]):

بس کب تلک تحمل بیدادِ روزگار ۔۔۔ سینہ تو مارے ضبط کے ہو ہو گیا فگار

۶۷۔ ایضاً (اشعار ۴۵[2]):

آئے گلگشت گلستاں کو جو وہ تازہ نہال ۔۔۔ تا لب فرش کرے اٹھ کے چمن استقبال

۶۸۔ مدح میرزا تقی (اشعار ۴۴[3]):

اس سال ہے سردی کی یہ تاثیر ہوا پر ۔۔۔ جوں موج ہوا یخ کی ہے زنجیر ہوا پر

اس قصیدے کے بعض اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی کو کبوتر بازی کا بھی شوق تھا، ان کی غزلوں میں بھی بعض ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں کبوتروں کے نام یا کبوتر بازی کی اصطلاحیں بیان کی گئی ہیں۔ یہاں یہ اشعار قابل غور ہیں[4]:

اس شوق کبوتر پہ نظر کر تو کہ اس جا ۔۔۔ پاتا ہوں فروشندوں کی تقریر ہوا پر
بکنے کو قفس کے قفس آتے ہیں ہمیشہ ۔۔۔ تا مشت پر ان کے کی ہو توقیر ہوا پر
جوڑی کے جو ہیں ان میں ہیں پر بستہ بریدہ ۔۔۔ اور بنگی جو ہیں اُن کی ہے تسخیر ہوا پر
لڑ جائے ہے گر ساتھ سے صیاد کے کوئی ساتھ ۔۔۔ رفعت میں دکھاتے ہیں وہ توقیر ہوا پر
یعنی کہ لگا لاتے ہیں ساتھ اپنے کبوتر ۔۔۔ یہ اُن کے کرٹے پن کی ہے تاثیر ہوا پر
مانند کبوتر کبھی کاشے سے نہ نکلے ۔۔۔ دوڑائے جیسے گردشِ تقدیر ہوا پر
غلطک وہ اس انداز سے کھاتے ہیں کہ تحسیں ۔۔۔ جاتی ہے مشعبد کا جگر چیر ہوا پر
ہر چرخ میں ہوتے ہیں ترے سر کے تصدق ۔۔۔ ہر دور تے میں ہیں حلقۂ تدبیر ہوا پر
پرواز میں ان کی ہے جو پستی و بلندی ۔۔۔ سب تیری نگہ کی ہے یہ تاثیر ہوا پر
او نچے ہوں تو ہو جاویں وہ پھر نظروں کے غائب ۔۔۔ گویا ہوئے عنقا کے گلوگیر ہوا پر
اور پھر جو فرود آویں تو جوں تخت سلیماں ۔۔۔ آنے میں لگے ان کو نہ تاخیر ہوا پر

---

[1] ب میں ۴۹۔ [2] اشعار ب۔ [3] ب میں اشعار ۴۶۔ ۳۔ ۵ یہ قصیدہ ب سے غیر حاضر۔
[4] خط کشیدہ الفاظ کبوتر بازوں کی اصطلاحیں ہیں۔

اس قصیدے کے آخری دو اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمین میں مصحفی نے چار قصائد لکھے تھے۔ اس سلسلہ کے دو قصائد تو وہ ہیں جو قصیدہ ۱۸، ۱۹ کے ذیل میں آتے ہیں اور ایک یہ ہے لامحالہ چوتھا قصیدہ ۶۹ کو ماننا پڑے گا۔

اے مصحفی میں یہ جو کہے چاروں قصیدے — ان چاروں عناصر کی ہے تعبیر ہوا پر
مانند عناصر کے رہیں چاروں یہ باہم — اور آئے نہ ان کے کبھی تغییر ہوا پر

اسی قصیدے میں صفحہ ۲۳۴ پہ شنگرفی روشنائی سے عنوان "در بیان سردی" قائم کیا گیا ہے جس کی ابتدا مطلع ذیل سے ہوتی ہے۔

ہے نفس کشی سے جسے توقیر ہوا پر — وہ کاٹ کے پھینکے سر تقصیر ہوا پر

لیکن اس میں مشکل ہی سے کوئی شعر دربیان سردی، ملے گا۔ میرا خیال ہے یہ عنوان سہو کاتب ہے، یہاں سے اسی قصیدے کا مطلع ثانی شروع ہوتا ہے اور اس کے بعد یہ کبوتر والے (محولہ بالا) اشعار آئے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ علاحدہ عنوان کے تحت درج ہے اس لیے ہم نے بھی اسے الگ شمار کر لیا ہے۔ اور اسے شامل کر کے ہی اس زمین کے قصائد کی تعداد چار ہو سکتی ہے۔

۶۹۔ دربیان سردی (اشعار ۳۳):

ہے نفس کشی سے الخ

۷۰۔ جواب قصیدہ انشاء اللہ تعالیٰ (کذا) (اشعار ۱۰۱)[1]:

کھل گئی منھ پہ مرے شب جو درخواب کی پٹ — نظر آئی مجھے اک طرفہ کھبو کاٹ کسٹ،

اس قصیدے میں بعض انگریزی الفاظ کا استعمال قابل غور ہے:

---

[1] نسخہ ب میں تعداد اشعار (۷۰) ہے شاعر یں (۶۹) دی گئی ہے۔ یہ قصیدہ ناقص الاول ہے اور ب میں اسی شعر سے شروع ہوتا ہے۔

اس سے پوچھا میں کہ تو کون ہے کس کا ہے یہ باغ — جس کے پھولوں میں ہے دلہن کے پھپر کھٹ کی لپٹ

یہ نواب علی خاں کی مدح میں ہے۔ نسخہ ب میں یہ قصیدہ نمبر ۶۸ ہے۔

ملک گیری میں گورنر تجھے سمجھے جو فلک | ہووے پھر کیوں نہ کلکٹر ترے لیٹ اورایٹ[۱]
سارے عالم میں ترا حکم ہے دائر سائر | کیوں نہ حاضر رہیں دربار پہ اپیل اور کورٹ[۲]
دیکھ کر قصر معلیٰ کا ترے نقش و نگار | اپنی کوٹھی کو کرے اس پہ تصدق ازنٹ[۳]

(۱) مدح اسپاں نواب جلال الدولہ بہادر[۴] (اشعار ۴۹):

یعنی ہے لالہ رنگ تو پکھراج ڈہڈ ہا | خود لعل بے بہا ہے ترا لال بے بہا

(۲) در جواب میرزا رفیع السودا (قصیدہ در مدح نواب وزیر یمین الدولہ سعادت علی خاں، بروز جشن جلوس) (اشعار ۴۴[۵]):

شب دو شیشہ رکھی میں نے پلک پر جو پلک | اک پری کی سی شباہت گئی آنکھوں جھلک
لے قصیدے کو یاں نہ حریفان دیگر | نہیں ہرگز میں کسی در پہ گیا آج تلک
روز و شب کنج قناعت میں رہوں ہوں بیٹھا | گرچہ شاعر ہوں ولے یہ نہیں میرا مسلک
آرزو ہے کہ گزر جائے کرم سے تیرے | آخر عمر مری با دف و چنگ و بینک
آنکھ سے میری جدا ہووے نہ رخسار نکو | کان سے میرے جدا ہووے نہ طبلہ کی گمک

(۳) مدح کلب علی خاں (اشعار ۴۵[۶]): (بہ تقریب عید قرباں)

لیتے خمیازہ جو اس گل کی گئی چولی مسکی | جا پڑی صاف بدن پر نگہ اہل ہوس

(۴) مدح نواب غازی الدین حیدر (اشعار ۸۸[۷]):

اگر نزاکت موئے میاں کرو ں تحریر | شکست چینی فغفور ہو شکست تدبیر (کذا)
یہ مصحفی جو ترا مدح گو ہے حال کے بیچ | کہے تھے اس نے قصیدے بہت بمدح وزیر
حسد سے اس کی نہ کی رہبری کسی نے وہاں | نہ کچھ اسی سے بن آئی تلاش نے تدبیر

---

[۱] ظاہراً یہ دونوں انگریزوں کے نام ہیں۔ [۲] اسم معرفہ۔
[۳] نواب مہدی علی خاں۔ [۴] ب میں تعداد اشعار ۱۴۔ [۵] یہ کلب علی خاں نواب سعادت علی خاں کے فرزند تھے۔ ب میں اس قصیدے کے ۴۷ اشعار ہیں اور اسی پر یہ نسخہ تمام ہو جاتا ہے۔ [۶] ب سے غیر حاضر۔

فشارِ قبر ہے اس کو مفلسی کا فشار ۔۔۔ ہر ایک موج ہوا بلکہ ذرہ تعزیر

۷۵۔ مدح کلب علی خاں (بتقریب عید) اشعار ۵۵[۱]

زبس کہ شوقِ جنوں ہے مرا گریباں گیر ۔۔۔ ہر ایک تار سے آتا ہے نالۂ زنجیر

اس قصیدے میں مصحفی نے دعویٰ کیا ہے کہ زمانہ کبھی اہل کمال سے خالی نہیں رہتا، اگرچہ:

ہزار حیف کہ دنیا سے چل بسے سب یار ۔۔۔ نہ سوز و قائم و سودا رہا نہ درد نہ میر

خدا رکھے تجھے اے مصحفی کہ اب تو ہے ۔۔۔ عوض سبھوں کے نوا سنج گلشن تقریر

پھر ان اساتذہ کے نقائص اور کمالات کا اظہار کیا ہے۔ اپنی مختلف علوم و فنون سے واقفیت کا بھی ذکر ہے۔ اور تان یہاں توڑی ہے۔

زمانہ عرصہ میں لایا ہے تجھ سا جامع کم ۔۔۔ عجب نہیں جو تری خاک تن ہو سب اکسیر

۷۶۔ ایضاً (اشعار ۵۹)[۲]:

ہو نباتات میں جب موج نباتی کا عمل ۔۔۔ شجر خشک سے کیوں برگ و بر آویں نہ نکل

۷۸۔ مدح نواب معتمد الدولہ بہادر (اشعار ۴۹)[۳]:

کیا ہے مجھ پہ یہ جورِ فلک نے عرصہ تنگ ۔۔۔ کہ رات دن ہوں نصیبوں سے اپنے برسرِ جنگ

۷۹۔ مدح نواب روشن الدولہ بہادر (اشعار ۴۵)[۴]:

قلم وال زیرِ کرسی کیوں نہ رکھے فکرِ خاقانی ۔۔۔ مرے زانو سے پھر پیدا ہوا ہے ربطِ پیشانی

۸۰۔ ایضاً (اشعار ۴۰)[۵]:

نسیم مژدہ یہ لائی سحر سوئے عالم ۔۔۔ کہ صبح سے ہوں مہیائے کار سب خدام

۸۱۔ مدح روشن الدولہ (اشعار ۴۱)[۶]:

میں ایک رات جو تھا غم کے ساتھ ہم بستر ۔۔۔ صبا نے مژدہ دیا آ کے مجھ کو وقتِ سحر

---

۱ ب سے غیر حاضر ہے۔ ۲ ب سے غیر حاضر ہے۔ ۳ ب سے غیر حاضر ہے۔ ۴ ب سے غیر حاضر ہے۔
۵ ب سے غیر حاضر ہے۔ ۶ ب میں عنوان: مدح آفریں علی خاں۔ الف میں کوئی عنوان نہیں۔ گریز میں روشن الدولہ کا نام آگیا ہے۔

۸۲۔ مدح نواب ہادی علی خاں[1] (اشعار ۲۸):

اے خامہ چاہیے کہ تو ہو ز ابتدائے کار
صرف ثنائے ہادی علی خانِ جم وقار

۸۳۔ مدح میر فضل علی (اشعار ۷۰)[2] (بتقریب عید قرباں):

یہ چاہتی ہے طبیعت بحکم ربِ قدیر
کہ ریختہ کی زمین سخن میں ہو تعمیر

دکھائے ناطقہ خوبیِ زبانِ اردو کی
قلم معانیِ نازک نمو کرے تحریر

نہ پہنچے جس کے تئیں نقش خامۂ سودا
نہ پاسکے لب و لہجہ کو جس کے دعوی میر

اگرچہ ناسی گوئی ہے میری مشق نخست
زبان ریختہ کو جان تو دمِ تصویر

مصورِ قلم ہوں میں حسن معنی میں
ہے طبع زاد مرا نقشۂ صغیر و کبیر

۸۴۔ ایضاً[3] (اشعار ۶۷):

جب حوت سے حمل میں ہوا مہر کا گذار
دن مشتری کے زہرہ کی ساعت کیے اختیار (کذا)

۸۵۔ ایضاً (اشعار ۶۹)[4] (قصیدہ در تہنیت عید):

رکھی ہے جب سے صنم تم نے بے حجاب قلم
ثنا میں ان کی سیاہی کی ہے خراب قلم

۸۶۔ مدح نواب معتمد الدولہ (اشعار ۸۴)[5]

آیا ہے جب سے دیکھ رخ دلبر آفتاب
کھاتا ہے اس کے بام پہ نت چکر آفتاب

ہے یہ قصیدہ بارہ سی سیں تیس سن کا نظم (کذا)
نامے قلم سے نکلا ہے جوں بن کر آفتاب

نسخۂ رام پور (ب) میں قصائد کی تعداد ۶۹ ہے اور اُن کے اشعار کی مجموعی تعداد تین ہزار آٹھ سو سولہ (۳۸۱۶) ہوتی ہے[6]۔ نسخۂ ب میں قصائد ذیل نہیں ہیں اس طرح

---

[1] ب سے غیر حاضر ہے۔ [2] یہ قصیدہ ب میں نہیں ہے۔ [3] ب سے غیر حاضر ہے۔
[4] ب سے غیر حاضر ہے۔ [5] ب سے غیر حاضر ہے۔
[6] شاعر (۲: ۶۱) میں قاضی عبد الودود صاحب نے تعداد اشعار ۹۰۰۰ بتائی ہے یہ بجا کتابت کی غلطی ہے۔ مجھ سے بھی ان کے شمار میں سہو ممکن ہے۔ مگر یہ تعداد بہر حال ساڑھے تین ہزار سے زیادہ ہے۔ نسخۂ الف میں ب سے ایک ہزار اشعار کے لگ بھگ زیادہ ہیں۔

گویا ہمارے نسخہ قصائد میں، ا قصیدے زائد ہیں:

قصیدہ ۵، ۵۔ ۱۵۔ ۱۸۔ ۱۹۔ ۶۸۔ ۶۹۔ ۷۴۔ ۷۵۔ ۷۷۔ ۷۸۔ ۷۹۔
۸۰۔ ۸۲۔ ۸۳۔ ۸۴۔ ۸۵۔ ۸۶۔

یہاں یہ اظہار بھی مناسب ہوگا کہ نسخۂ رام پور ناقص ہے اس میں قصائد ۶۴۔ ۶۵ نامکمل ہیں اور ان کے درمیان کا ایک یا اس سے زیادہ اوراق غائب ہیں۔ اس نسخہ میں بیشتر قصائد پر عنوان بھی نہیں ہے دیوان قصائد کا نسخہ الف عرصہ ہوا جب مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے دیکھا تھا اور انھوں نے اسی نسخہ سے بعض عنوانات اپنے قلم سے لکھ دیے ہیں۔ نسخہ ب میں مندرجہ ذیل قصائد کے عنوانات عرشی صاحب کے قلم سے لکھے ہوئے ہیں:

قصیدہ ۱، ۵، ۲۶۔ ۲۷۔ ۳۰۔ ۳۱۔ ۳۴۔ ۴۴۔ ۴۵۔ ۴۸۔ ۵۳۔
۵۴۔ ۵۹۔ ۶۱۔ ۶۳۔ ۶۵۔ ۶۷۔

دیوان مصحفی چہارم کا ایک اور قلمی نسخہ جس کا حوالہ ابتدا میں دیا گیا ہے اور جسے ہم یہاں نسخۂ ج لکھیں گے قصائد و قطعات و غزلیات کا مجموعہ ہے۔ اس میں یہ قصائد شامل ہیں:۔

۱۔ در مدح حضرت علی مرتضیٰ (تعداد اشعار ۵۲)[1]

تیرہ روزی سے مری کیوں کہ نہ ہو شاد آتش　　شب کو آتی ہے نظر جیسے پری زاد آتش

۲۔ قصیدہ در تعریف و مدح مرشد زادہ آفاق مہر سپہر سر ریسلطنت شاہ زادہ مرزا سلیمان شکوہ در تہنیت نوروز (اشعار ۹۰)[2]

یہ جوش نامیہ اب کی ہوا ہے فصلِ بہار　　کہ دانہ ہو ہے ہر امر غ کے تہ منقار

۳۔ قصیدہ دیگر در مدح شاہزادہ جہان و آفاق مرزا سلیمان شکوہ (اشعار ۱۳۷)[3]

---

[1] الف میں قصیدہ نمبر ۱۴ تعداد اشعار ۱۵، نسخہ ج میں عنوان نہیں ہے۔ [2] الف میں قصیدہ نمبر ۹ و ب میں تعداد اشعار ۹۱۔ [3] الف میں تعداد اشعار ۱۸۲ (قصیدہ نمبر ۴۰)

[redacted]

گر بازمعانی کا مرے ہو وے ہواگیر   پیدا کریں احرار ہوا حکم عصا فیر

۴- مدح سلیمان شکوہ (اشعار ۶۷)؛[1]

خورشید نہ ہو جس مہ تاباں کے برابر   ہو کیوں کہ ہلال اس کے گریباں کے برابر

۵- مدح سلیمان شکوہ[2] (اشعار ۶۰)؛

تلتا ہیں اس کے پلّے میں ہو تا گرانوری   مرزا و میر سے مجھے کیا ہے برابری

۶- مدح سلیمان شکوہ[3] (اشعار ۳۰)؛

ہو کے آپس میں چہ روزا و رچہ شب ساٹھوں ایک   تیری رکھتے ہیں اب اے ماہ طلب ساٹھوں ایک

۷- مدح سلیمان شکوہ (اشعار ۸۲)[4]؛

یہ عکس ماہ سے ہے چہرۂ زمیں پر نور   کہ شکل جادہ ہے صحرا میں رشک سا عدحور

(نوٹ) نسخۂ ج میں ۶ قصائد ۴۵ غزلیات ۸ رباعیات ہیں تعداد اوراق ۹۴ مسطر ۱۵ یہ مصحفی کی زندگی میں لکھا گیا ہے چنانچہ رباعیات کی ابتدا میں عنوان ہے "شروعات رباعیات من تصنیف میر مصحفی سلمہ اللہ تعالیٰ" یہ غالباً سلیمان شکوہ کے کتب خانے میں رہ چکا ہے ورق ۳۰ ب پر ایک مہر گی ہے جس میں یہ شعر لکھا ہوا ہے:

خوش است مہر کتب خانۂ سلیمان (جاہ)   ہر کتاب مزیّن چو نقش بسم اللہ دکھنا،

اس نسخے کے بارے میں یہ اطلاع کرمی سید محمود حسین امروہوی (رضا لائبریری رام پور) نے فراہم کی تھی ان کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔

[1] الف میں قصیدہ نمبر ۴۲ تعداد اشعار ۶، ج میں عنوان نہیں ہے۔

[2] ج میں عنوان نہیں ہے۔ الف میں یہ قصیدہ نمبر ۴۴ اور تعداد اشعار ۶۲۔

[3] ج میں عنوان نہیں ہے۔ الف میں یہ قصیدہ نمبر ۴۴ پر ہے اور اشعار کی تعداد ۶۲۔

[4] الف میں قصیدہ نمبر ۴۵ تعداد اشعار ۸۰، ج میں عنوان نہیں۔

۸۔ قصیدہ نعتیہ شہ (اشعار ۵۹):
خامے نے یہ تری سرنامہ نگار انگشت کہ ہو نہ پنجۂ مژگاں کی زینہار انگشت
۹۔ در مدح اسپ کہ یابو خادار نام داشت ^(۲) (اشعار ۲۷)
ہم ماہ سر بلند ہے ترا سم ہم زلف طویل ہے تری دم
۱۰۔ در مدح صاحب عالم ^(۳) (اشعار ۴۰):
لکھے نہ کیوں لکہ زمیں رشک گلستاں نوروز کہ ہے بہار پہ بسی گلفشاں نوروز
۱۱۔ در مدح سلیمان شکوہ ^(۴) (اشعار ۳۳):
کون ہوں میں خدا یگان سخن ہے مرے حکم میں جہان سخن
۱۲۔ قطعہ بعد قصیدہ غزل کردن در طلب ترک حضور دیافتن دو شالہ د گوشوارہ برائے تسکین ^(۵) (اشعار ۱۹)
اے سلیماں جم شکوہ کہ ہے نام تیرا بخسروی مشہور
۱۳۔ در مدح صاحب عالم قصیدہ ناتمام ^(۶) (اشعار ۱۸)
خطائے خصم نہیں کچھ یہ بخت کا ہو قصور کہ مجھ سے طور بخشش نہیں مزاج حضور
۱۴۔ قصیدہ در مدح خلف الرشید نواب وزیر مرحوم یعنی مرزا سیف علی ^(۷) (اشعار ۶۲):
ہاتھ ہر سطر کا پہنچے تا بداماں قلم چاک اس غم سے جب دیکھو گریباں قلم

---

^(۱) نج میں عنوان نہیں مگر الف اور ب میں یہ قصیدہ نعتیہ ہے الف میں نمبر ۴ تعداد اشعار ۵۹
^(۲) نج میں عنوان نما در الف میں نمبر ۴۶ تعداد اشعار ۲۷۔
^(۳) نج میں عنوان نمارد الف میں یہ قصید نمبر ۹ ہے۔
^(۴) نج میں عنوان ندارد الف میں قصیدہ نمبر ۵۰۔ ^(۵) الف میں قطعہ نمبر ۴۸۔
^(۶) نج میں عنوان ندارد۔ یہ عنوان نسخہ الف کا ہے، اس میں قصیدہ نمبر ۵۱۔
^(۷) الف میں قصیدہ نمبر ۳۷ تعداد اشعار ۶۱۔

۱۵۔ قصیدہ در معذرت اتہام انشا بجناب فیض مآب مرشد زادہ مرزا سلیمان شکوہ (اشعار ۴۲)؛[1]

قسم بذات خدائے کہ ہے سمیع و بصیر — کہ مجھ سے حضرت شہ میں نہیں ہوئی تقصیر

۱۶۔ قصیدہ در مدح مرشد زادہ در شب عید کہ قطعہ مبارکبادی در حضور پرنور خواندہ شد (اشعار ۲۸)؛[2]

یہ چاہیے کہ جو شاعر ہو بندۂ درگاہ — زباں پہ لاوے نہ کچھ غیر حرف مدحت شاہ

دیوان قصائد کے نسخۂ ب میں کوئی قصیدہ ایسا نہیں ہے جو الف میں نہ ہو، نسخۂ الف میں جو قصائد زیادہ ہیں ان کی تفصیل درج کی جا چکی ہے نسخۂ ج میں صرف آخری قصیدہ در مدح سلیمان شکوہ زیادہ ہے یہ نسخہ الف اور ب دونوں سے غیر حاضر ہے۔

کلیات مصحفی نسخۂ لاہور میں قصائد کے تین دیوان ہیں ان کا عنوان ہے:

"جلد ہائے قصائد میاں مصحفی سلمہ کہ از دست خاص نقل گرفتہ شد"[3]

پہلے دیوان میں ۴۲ قصائد ہیں بتفصیل ذیل:

(۱) قصیدہ نعتیہ۔ (۲) قصیدہ نعتیہ۔ (۳) قصیدہ در مدح صفدر علی خاں (۴) قصیدہ در مدح مرزا محمد تقی ہوس (۵) ایضاً (۶) ایضاً (۷) دربیان مرثیے (۸) قصیدہ جواب قصیدۂ انشاء اللہ خاں در مدح نواب علی خاں (۹) مدح اسپان جلال الدولہ بہادر (۱۰) قصیدہ در جواب قصیدہ مرزا رفیع سودا

۱؎ الف میں قطعہ نمبر ۵۲ تعداد اشعار ۴۱۔

۲؎ یہ قصیدہ الف اور ب سے غیر حاضر ہے۔

۳؎ کلیات مصحفی (قلمی نسخہ لاہور)، ص ۳۰۸ بحوالہ مصحفی اور ان کا کلام/۱۲۰ یہ تفصیل اسی کتاب سے اخذ کی گئی ہے۔

درمدح سعادت علی خاں (۱۱) درمدح کلب علی خاں (۱۲) مدح نواب غازی الدین حیدر (۱۳) مدح کلب علی خاں (۱۴) ایضاً (۱۵) ایضاً (۱۶) مدح نواب معتمد الدولہ بہادر (۱۷) مدح نواب روشن الدولہ (۱۸) ایضاً (۱۹) ایضاً (۲۰) مدح نواب ہادی علی خاں (۲۱) مدح میر فضل علی (۲۲) ایضاً (۲۳) ایضاً (۲۴) مدح نواب معتمد الدولہ بہادر۔

دوسری جلد میں قصائد نعت و منقبت شامل ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) قصیدہ نعتیہ (۲) ایضاً (۳) ایضاً (۴) قصیدہ درمنقبت حضرت علی مرتضیٰ (۵) ایضاً (۶) ایضاً (۷) ایضاً (۸) ایضاً (۹) ایضاً (۱۰) ایضاً (۱۱) ایضاً (۱۲) درمنقبت امام حسن علیہ السلام (۱۳) درمنقبت امام حسین علیہ السلام (۱۴) درمنقبت حضرت امام زین العابدین علیہ السلام (۱۵) قصیدہ درمدح علی اکبر (۱۶) ایضاً۔

تیسری جلد میں اُمراء و سلاطین کی مدح میں لکھے ہوئے قصائد ہیں:

(۱) مدح جہاں دار شاہ (۲) درمدح صاحب عالم (۳) درمدح آصف الدولہ بہادر (۴) ایضاً (۵) ایضاً (۶) ایضاً (۷) درمدح یوسف علی خاں (۸) ایضاً (۹) ایضاً (۱۰) ایضاً (۱۱) ایضاً (۱۲) ایضاً (۱۳) درمدح نواب محبت علی خاں (۱۴) ایضاً (۱۵) ایضاً (۱۶) قصیدہ تیغ بُرّاں (۱۷) مدح شیدی علی خاں (۱۸) ایضاً (۱۹) درمدح سلیمان شکوہ (۲۰) ایضاً (۲۱) ایضاً (۲۲) ایضاً (۲۳) ایضاً (۲۴) ایضاً (۲۵) ایضاً (۲۶) درمدح اسپ کہ یار وفادار نام است (۲۷) نسبت انشاء اللہ خاں (۲۸) قطعہ درخدمت سلیمان شکوہ (۲۹) درمدح صاحب عالم (۳۰) درمدح سلیمان شکوہ (۳۱) درمدح صاحب عالم قصیدہ ناتمام (۳۲) مدح و عرض حال سلیمان شکوہ (۳۳) مدح آصف الدولہ بہادر (۳۴) درمدح خیالی رام (۳۵) ایضاً (۳۶) ایضاً (۳۷) ایضاً (۳۸) قصیدہ (۳۹) مدح مرزا علی حسن خلف نواب سالار جنگ (۴۰) مدح نواب آصف الدولہ

بطور جلال گفتہ شد (۴۱)، مدح مرزا احسن علی (۴۲)، مدح لالہ ٹیکا رام (۴۳)، قصیدہ نسبت بہ چند شخص گفتہ (۴۴)، مدح خیالی رام۔

ان قصائد کی مجموعی تعداد (۴۸) ہوتی ہے، بظاہر اس فہرست میں کوئی قصیدہ ایسا نہیں ہے جو نسخۂ الف میں موجود نہ ہو، بلکہ نسخۂ الف میں کلیات نسخۂ لاہور سے بھی دو قصائد زیادہ ہیں۔ اس طرح یہ قصائد مصحفی کا سب سے معتبر اور مکمل نسخہ ہے۔ (۱۹۵۸ء)

مرزا محمد حسن قتیل اور ہفت تماشا

(الف) حیات و سیرت

مرزا محمد حسن قتیل،[1] اصلاً بٹالہ[2] ضلع گورداسپور (پنجاب) کے کھتری بھنڈاری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔[3] ان کا خاندانی نام دیوانی سنگھ[4] تھا۔ شجرہ خاندان جو جناب مالک رام کو اسی دودمان کے ایک رکن سے پہنچا تھا۔ یہ ہے[5]

---

[1] ظاہر ہے مرزا لقب تعظیمی کے طور پر اضافہ ہوا ہے۔ یہ قتیل کے نام کے ساتھ کب سے رائج ہوا، کہنا مشکل ہے۔ قتیل کا نام بعض کتابوں میں باختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً محمد احسن (صحائف شرائف۔ نیز دریائے لطافت مترجمہ۔ پنڈت کیفی ص ۳۵۹)، احمد حسن (قاموس المشاہیر جلد ۲ ص ۱۴۰)، محمد قتیل (خلاصۃ الافکار ابو طالب اصفہانی قلمی نسخہ۔ پٹنہ و دانش گاہ دہلی) مرزا محمد حسن خان (دستور الفصاحت۔ ص ۱۳۱)

[2] وطن میں بھی اختلاف ہے، اس کی بحث آگے آئے گی۔ بٹالہ کی دوسری شکلیں۔ بٹالی (مصحفی، عقد ثریا، ص ۴۶) پٹیالہ (عبرت، و ریاض الافکار)، نیز پٹیالہ، "سوائے پٹیالہ مشہور کہ ما بین راوی و بیاہ از مضافات صوبہ لاہور متصل امرت سر... واقع است (نشتر عشق جلد ۲)

[3] یہ معلوم ہے کہ خلاصۃ التواریخ کے مؤلف سجان رائے بھنڈاری، اور مصطلحات شعرا کے مصنف سیالکوٹی مل وارستہ کا شجرہ بھی قتیل ہی کے خاندان سے ملتا ہے (مسلسل)

اچنت رائے

مہر چند
امر سنگھ
چوہڑ مل
رائے انند سنگھ
رائے کشن چند
رائے بھاگ سنگھ
رائے کانشی رام
رائے بھوانی سنگھ بھنڈاری
ایم لے (مرسلہ شجرہ)

صورت سنگھ
دیوان فتح چند
رائے لعل جی مل

درگاہی مل
جواہر سنگھ
(ان کی اولاد لکھنؤ میں ہے)

دیوانی سنگھ (مسلمان ہو گئے، قتیل تخلص)

بہادر سنگھ
دھونکل سنگھ
(ان کی اولاد لکھنؤ میں ہے)

آغا حسین قلی خاں عاشقی نے قتیل کے خاندان اور ابتدائی زندگی کے بارے میں جو معلومات فراہم کیے ہیں۔ وہ قابل قدر ہیں۔ ان کا ملخص ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے:

" ان کے آباؤ اجداد قصبہ پٹیالہ (بٹالہ ؟) کے رہنے والے تھے جو مشہور مقام پٹیالہ سے مختلف جگہ ہے۔ ایک زمانہ گزرنے پر ان کے جد سومی (صورت سنگھ ؟) نے قوم کھتری کے ایک فرد کے ہمراہ، جو ان سے دوستی رکھتا تھا، اپنے موروثی مکان کو چھوڑ کر باگپت (باغپت ؟) میں نزول کیا، جو دریائے جمنا کے پار

---

(۱) شیر اقتباس صفحہ ۱۰۶) تذکرہ سفینۂ ہندی ۲/۱۰۲، بعض تذکرہ نگار دل ... وارستہ کو قتیل کا ... باپ ... انیس الداشقین بحوالہ معاصر ۴)

(۲) شجرۂ خاندانی میں یہی نام پہنچا ہے تفصیل خط کے سبب دوسری روایات: دیوالی سنگھ اور دیوالی سنگھ بھی ملتی ہیں۔

(۳) مالک رام: قتیل پنجابی تھا، نگار لکھنؤ جلد ۴۲ شمارہ ۱/۲

(۴) نشتر عشق حصہ ۲ (قلمی نسخہ بانکی پور پٹنہ۔ بحوالہ معاصر حصہ ۴ تذکرے کے مختصر تعارف کے لیے ملاحظہ ہو دیباچہ دستور الفصاحت۔

دہلی سے سترہ کوس کے فاصلے پر ایک شہر ہے، قتیل کے والد اور دادا وہیں پیدا ہوئے جب قتیل کے دادا نے فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) کے جلوس کے سترہویں سال (مطابق ۱۱۴۸ھ-۳۶-۱۷۳۵ء) وفات پائی تو ان کے باپ (درگاہی مل) نے باغپت سے نقل مکان کر کے دہلی سے بارہ کوس کے فاصلے پر قصبہ ڈاسنہ میں سکونت اختیار کر لی[1]۔ یہاں دو تین ہی سال گزر رہے تھے کہ نواب ہدایت علی خاں بہادر نے شاہ جہاں آباد پہنچ کر یہ صوبہ مناجری پر لیا۔ تو اپنی ہم مکتبی نیز ان روابط قدیم پر نظر کر کے جو سید فیض اللہ خاں اور ان کے دادا کے وقت سے آپس میں چلے آ رہے تھے ان کے والد (درگاہی مل) کو ڈاسنے سے بلا بھیجا، اور "دلجوئی و چارہ سازی" کے ساتھ پیش آئے، ہزار روپیا (سالانہ) ان کی ذات کا مقرر کر کے اجازت دی کہ اپنے گھر میں بال بچوں کے ساتھ رہیں (یعنی تکلیف نوکری سے معاف رکھا) چنانچہ درگاہی مل کبھی ان کی سرکار میں رہتے تھے، کبھی ڈاسنے چلے جاتے تھے اور فارغ البال زندگی گزار رہے تھے۔ اسی زمانے میں قتیل ۱۱۷۲ھ-۵۹-۱۷۵۸ء[2] میں دہلی پیدا ہوئے۔ سترہ سال کی عمر تک صرف و نحو، منطق و حکمت، معانی و بیان و بدیع

---

[1] اس کا امکان ہے کہ باغپت اور پھر ڈاسنے میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے باوجود درگاہی مل کی شادی پنجاب میں ہوئی ہو کیوں کہ قتیل نے ہفت تماشا باب دوم میں لکھا ہے کہ "بعض کھتری جو مدت سے پنجاب کی سکونت چھوڑ کر پورب میں رہنے لگے ہیں۔ پنجابی کھتری ان کے ساتھ ایک برتن میں کوئی چیز نہیں کھاتے اور ان میں آپس میں رشتہ بھی نہیں کیا جاتا ..... لہذا وہ کھتری جو پنجاب سے پورب کے شہروں میں آتے ہیں۔ اور یہاں خوشحال زندگی بسر کرنے کے باعث۔ یہیں بس جاتے ہیں جب ان کا لڑکا جوان ہو جاتا ہے تو شادی کے لیے اسے اپنے وطن کو بھیج دیتے ہیں۔"

[2] قدرت اللہ شوق گوپاموی: نتائج الافکار/ ۵۷۲ (طبع بمبئی)، نیز صدیق حسن خاں شمع انجمن/ ۳۹۰ (طبع بھوپال)

دریاضی وعروض وعربی وفارسی، کی تحصیل کرتے رہے، آخر شعرگوئی کی طرف میلان ہوا، اور میرزا محمد باقر کرمان شاہ شہید کے شاگرد ہو کر ان سے فیض اٹھایا۔ ان کی صحبت کی برکت سے چودہ سال کی عمر میں مسلمان ہوئے۔ دو سال تک اسے اپنے عزیز واقارب سے مخفی رکھا۔ آخر جب سترہ سال کی عمر کو پہنچے تو اپنے اسلام کا اظہار کیا، اور مذہب اثنا عشری اختیار کیا اپنے گھر بار سے کنارہ کر کے آزادگی وتجرد کے میدان میں قدم رکھا۔[1]

قتیل کا وطن اور مولد بھی ایک نزاعی مسئلہ بن گیا ہے، کوئی اسے پٹیالہ سے منسوب کرتا ہے، کوئی پٹیالی سے، کوئی لاہور سے، کوئی فرید آباد سے اور کوئی دلی سے۔ سید اسد علی انوری فرید آبادی نے اپنے ایک مضمون میں یہ دعوی کیا تھا کہ: مرزا قتیل مرحوم کا خاندان ابھی تک فرید آباد میں آباد و خوشحال ہے، یہ کھتری صاحبان قصبے کے معززین میں سے ہیں۔ ان کی وہی گوت ہے جو قتیل کی بتائی گئی ہے۔ فیض آباد کے کھتریوں سے ان کی اب تک رسم وراہ اور رشتہ داری ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ان کے پاس قدیم شجرہ موجود ہے جس میں آج تک کے اندراج موجود ہیں، لیکن درگاہی مل والد مرزا قتیل کے آگے کوئی نام نہیں دیا گیا ہے۔ غالباً اس لیے کہ درگاہی مل کے صاحبزادے مسلمان ہو گئے تھے۔[2]

اس دعوے کی تردید میں ڈاکٹر مختار الدین احمد نے ایک مدلل مضمون لکھا[3] اور بیشتر مطبوعہ مآخذ کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا کہ مرزا غالب سے

---

[1] رام بابو سکسینہ (مرتب)، مرقع شعرا (طبع دہلی)

[2] اسد علی انوری: قتیل کا وطن، رسالہ نگار (لکھنؤ) جلد ۴۱ شمارہ ۵۔

[3] پہلے یہ غالباً نگار ہی میں چھپا تھا نظر ثانی کے بعد دوبارہ نقوش (لاہور)، مارچ ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ ہمارے پیش نظر نقوش کا ادب عالیہ نمبر ہے۔

پہلے کسی نے قتیل کو فرید آباد سے نسبت نہیں دی؎ اور غالب کے بیان کا یہ حال ہے کہ وہ ایک جگہ قتیل کو دہلوی اور؎ دوسرے موقع پر لکھنوی؎ بھی لکھتا ہے۔ دوسری دلیل یہ کہ کسی قدیم ذریعے سے قتیل کی نسبت وطنی تو کجا فرید آباد میں چند روزہ قیام بھی ثابت نہیں ہوتا؎

لیکن یہ نزاع اس طرح بھی طے ہو سکتا ہے کہ ہم ان سب بیانات کو متخالف نہ سمجھیں؛ اور ان کا باہمی ربط تلاش کر لیں۔ میرا خیال ہے کہ قتیل کے آباؤ اجداد کا وطن بٹالہ ہی ہے، اور اس کے دادا یا لعل جی مل وہاں سے نقل مکان کر کے نکلے تھے، مگر خود قتیل دہلی میں پیدا ہوا؎ جیسا کہ وہ خود کہتا ہے:

گرچہ باشد مولدِ من خاکِ دہلی اے قتیل!
کم کسے چوں من زبزد وایہ وال برخاستہ است

اس کے خاندان کے کچھ افراد تو بٹالہ میں رہ گئے، کچھ فیض آباد شاید وہاں سے لکھنؤ، پہنچ گئے۔ اور کچھ نے فرید آباد میں اقامت اختیار کر لی۔ فرید آباد، دہلی کے مضافات میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور اسے دہلی ہی کا

؎ مرقع شعراء شائع کردہ رام بابو سکسینہ۔ جس کا مرتب خود کو کایستھ بتاتا ہے۔ ایک قدیم ترمثال ہو سکتی تھی جس میں قتیل کو فرید آبادی لکھا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ مرقع شعراء ایک کھلی ہوئی جعل سازی ہے۔

؎ ملاحظہ ہو۔ مختار الدین احمد (مرتب)، احوال غالب/ ۲۰۵، ۲۱۲ (طبع علی گڑھ)

؎ اس کا ذکر ڈاکٹر مختار الدین نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ حوالہ نہیں دیا۔

؎ مضمون نگار نے ممکن مراجع سے باعتبار سنین یہ ثابت کیا ہے کہ کس سنہ میں قتیل کہاں رہا۔ فرید آباد میں اس کا جانا کسی تحریر سے مستفاد نہیں ہوتا۔ ؎ اس کی تائید بھگوان داس ہندی (سفینۂ ہندی/ ۲)، عاشقی، خوب چند ذکا۔ عبرتی عظیم آبادی، ابو طالب اصفہانی اور گراہم بیل بھی کرتے ہیں

ایک حصہ شمار کیا گیا ہے۔یہی ادّعا سید ہاشمی فرید آبادی نے کیا ہے[1]۔ان کا خیال ہے کہ قتیل کا دہلوی ہونا اور فرید آبادی نہ ہونا ایک دوسرے کے نقیض نہیں ہیں۔

قتیل کے سالِ ولادت میں بھی جھگڑا[2] ہے۔صحیح یہی ہے کہ وہ ۱۱۷۲ھ ۵۹-۱۷۵۸ء میں پیدا ہوا[3] اور علوم رسمیہ کی ابتدائی تعلیم کے بعد شروع جوانی[4] میں اپنا آبائی وطن ترک کر کے حلقہ بگوش اسلام ہوا کہتے ہیں کہ اس کی تعلیم و تربیت مرزا محمد باقر کرمان شاہ متخلص بشہید[5] کے ہاتھوں ہوئی اور انھیں کی ترغیب سے وہ مسلمان ہوا کچھ مدت تک اس نے تبدیلیٔ مذہب کا راز اپنے عزیزوں سے چھپایا، آخر ۱۸[6] سال کی عمر میں (تقریباً ۱۱۹۰ھ مطابق ۷۷-۱۷۷۶ء) اپنے نئے عقیدے کا اعلان کر دیا۔ظاہر ہے اس صورت میں خاندان اور اہلِ خاندان سے بھی معاشرتی تعلق منقطع ہو گیا[7]۔

بقول عاشقی، قتیل نے اثنا عشری فرقے کے عقائد اختیار کیے تھے[8]۔یہ کچھ مستبعد نہیں جب کہ وہ محمد باقر شہید کا تربیت یافتہ اور بخشی الملک ذوالفقار الدولہ

---

[1] سید ہاشمی فرید آبادی: قتیل کا وطن: رسالہ اردو سہ ماہی دہلی جنوری ۱۹۴۵ء۔
[2] اسد علی انوری نے فرقتی عظیم آبادی کے تذکرہ شمع انجمن (نایاب) کے حوالے سے ۱۱۶۲ھ سالِ ولادت لکھا ہے (نگار جلد ۱۴ ش ۵)
[3] نشترِ عشق (قلمی) نسخہ بانکی پور۔بحوالہ معاصر ۴۔
[4] نشترِ عشق (قلمی) بحوالہ معاصر ۴۔
[5] حیرت ہے کہ اٹھارھویں صدی کے بیشتر فارسی تذکروں میں شہید کا نام نہیں ملتا۔
[6] عبرتی: ریاض الافکار (قلمی) ورق ۵۳۔الف ' ورنہ ہفدہ سالگی ' ملکت: الگزشتری نتائج الافکار ۴/ ۵۔
[7] نشترِ عشق (قلمی) ج ۲　　[8] نشترِ عشق (قلمی) جلد ۲، نیز عبرتی۔ریاض الافکار (قلمی) ورق ۵۳۔الف۔

کالوگر تھا[1] پھر دربار اودھ سے توسّل پیدا ہوا تو وہاں بھی حکمرانوں کے شیعی عقائد تھے۔ لیکن اس کی تحریروں سے ان عقائد میں غلو کا ثبوت نہیں ملتا اور اس سے شبہ ہوتا ہے کہ عجب نہیں کہ دنیوی مصالح کے پیشِ نظر قتیل نے اثنا عشری فرقے کے عقائد اختیار کر لیے ہوں؛ جیسا کہ غلام ہمدانی مصحفی نے بھی نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں کیا تھا[3]۔ قتیل کے لیے بھی مصحفی نے اشارۃً لکھا ہے: "بس کہ در عہد نواب وزیر مرحوم رواج ایرانیاں بیشتر بود، مشارٌ الیہم دیدہ دیدہ ہمیں مذہب اختیار کردہ" خود قتیل نے بھی ہفت تماشا (باب دوم) میں لکھا ہے کہ "بہت سے لوگ شیعوں کی حکومت ہونے کے باعث تشیع کی طرف جھکتے ہیں"[2]۔

مصحفی کا قول ہے کہ قتیل کی ابتدائی تعلیم فیض آباد میں ہوئی تھی[4]۔ لیکن

---

[1] نجف خاں شیعہ تھا (ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی) اور یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کے عقائد سے اختلاف رکھنے والا کوئی شخص اس کے مصاحبوں میں داخل ہو سکے۔ مصحفی اس کے عہد وزارت میں گوشہ نشین ہو گئے تھے (تذکرہ ہندی / ۲۴۰) میرزا مظہر جان جاناں کی شہادت میں نجف خاں کا ایما بھی شامل ہو یہ کچھ بعید نہیں ہے۔

[2] اس کی تفصیل کے لیے ہفت تماشائے قتیل کے وہ بیانات ملاحظہ ہوں جو مذہب امامیہ اور شیعی رسوم سے متعلق ہیں مثلاً باب اول کا آخری حصہ۔

[3] مصحفی نے لکھنؤ میں متعہ بھی کیا تھا جسے وہ "محکم تر از نکاح" (مجمع الفوائد) کہتا ہے۔ لیکن اس نے ایک قصیدے میں بظاہر ان عقائد سے اپنی برأت کا اظہار بھی کیا ہے۔ تفصیل یہاں غیر ضروری ہو گی (ملاحظہ ہو۔ اسی کتاب میں مضمون بعنوان "قصائد مصحفی")۔

[4] مصحفی: عقد ثریا / ۴۶ "در ایامے کہ متعلقانش بحسب آب خورد بفیض آباد رفتہ اقامت گرفتند بر دست میرزا محمد باقر شہید اصفہانی ہیژدہ سالہ بود کہ بشرف اسلام پیوستہ۔ درآں ایام ہم درس کتاب از مرزا می گرفت"۔

بعض تذکرہ نگاروں نے[1] یہ کہا ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے سے پہلے دہلی آیا اور عربی وفارسی کی متداول درسی کتابیں پڑھیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ مصحفی نے خود قتیل سے معلوم کر کے لکھا ہوگا۔ عاشقی کے قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم اور تبدیل مذہب دہلی میں ہوا[2]۔ قتیل نے اپنی ولادت ۱۱۷۰ھ مطابق ۵۷-۱۷۵۶ء سے اسلام لانے تک کا زمانہ بظاہر دو شہروں میں گزارا ہے۔ یعنی دہلی اور فیض آباد میں۔ اس کے بعد ۱۱۹۰ھ مطابق ۷۷-۱۷۷۶ء کے لگ بھگ وہ ذوالفقار الدولہ نجف خاں کے لشکر میں شریک ہو کر[3] دہلی و اطراف میں بسر کرتا رہا[4]۔

بظاہر نجف خاں سے یہ تعلق اس کی موت د ۸ رجمادی الثانی ۱۱۹۶ھ / ۱۷۸۲ء تک باقی رہا۔ قتیل اکثر دہلی آتا رہتا تھا۔ چنانچہ ہم اسے ان مشاعروں میں بھی موجود پاتے ہیں[5] جو عہد نجف خانی میں مصحفی کے مکان پر ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں قتیل نے مصحفی کو فارسی شعرا کا تذکرہ عقد ثریا لکھنے کی ترغیب دی[6]، بلکہ کچھ مواد بھی، جو قتیل نے فراہم کر رکھا تھا، یا زبانی یاد تھا تذکرے میں شمول کے لیے لکھوا دیا۔

نجف خاں کے لشکر سے علاحدہ ہو کر قتیل نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ اور پھر اسے اپنا وطن ہی بنا لیا کیوں کہ ۱۱۹۸ھ / ۸۴-۱۷۸۳ء سے آخر دم تک وہ لکھنؤ میں رہا چند سفر ضرور

۱؎ شوق: نتائج الافکار، ۴/ ۵۷، نیز بھگوان داس ہندی، سفینۂ ہندی/ ۱۷۲
۲؎ عاشقی: نشتر عشق، حصہ ۲ (قلمی نسخہ بانکی پور)، بحوالہ معاصر ۴
۳؎ مصحفی: عقد ثریا/ ۴۶
۴؎ کیا یہ ممکن نہیں کہ اسی زمانے میں قتیل نے فریدآباد میں کچھ وقت گزارا ہو، نجف خاں کا بہیر و بنہ ان دنوں آگرہ اور دہلی کے درمیان منڈلاتا رہتا تھا۔
۵؎ مصحفی: عقد ثریا/ ۲
۶؎ مصحفی: عقد ثریا/ ۲

پیش آئے مگر وہ مختصر وقفوں کے لیے تھے[1]

1196ھ/1782-83ء سے 1225ھ/1810ء تک کا زمانہ اس نے لکھنؤ میں گزارا ہے[2] چوں کہ تذکرۂ ہندی کی ترتیب کے وقت وہ لکھنؤ میں موجود ہے[3]۔ یہ زمانہ لازماً 1209ھ/1794-95ء تک کا ہے۔ ابوطالب اصفہانی نے بھی اسے 1200ھ/1785-86ء میں مقیم لکھنؤ بتایا ہے[4]۔ 1212ھ/1797-98ء میں خود قتیل نے عبدالقادر خاں کے مکان پر خواجہ محمد علی تمنا سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے[5]۔ 1215ھ/1800-01ء میں وہ نواب عماد الملک کی ملازمت میں کالپی چلا گیا تھا[6] جہاں اس کا قیام 1217ھ/1802-03ء تک رہا[7]۔ 1221-22ھ/1806-07ء میں انشاء اللہ خاں انشا (متوفی 1233ھ/1817-18ء) نے دریائے لطافت لکھی تو اس کا آخری حصہ جو معانی و بدیع سے متعلق

---

[1] ان سفروں کا حال مرزا قتیل کے رقعات معدن الفوائد (طبع نولکشور 1881ء)، ہفت تماشا، دیباچہ عمان المعانی (قلمی نسخہ مملوکہ قاضی عبدالودود صاحب پٹنہ بحوالہ نقوش ادب عالیہ نمبر) وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً: معدن الفوائد ص 41، ص 49، 70، وغیرہ نیز ہفت تماشا۔ مولف عیار الشعراء (قلمی) کا یہ بیان کہ قتیل مدتوں ملک اصفہان میں رہا، بظاہر غلط ہے۔ اس کی تصدیق کہ قتیل کبھی ہندستان سے باہر گیا ہو۔ کسی ذریعے سے نہیں ہوتی۔

[2] مصحفی۔ عقد ثریا/42، مصحفی: تذکرۂ ہندی/60، (ترجمۂ رند) نیز عقد ثریا/14 (ترجمۂ بےتاب)

[3] مصحفی: تذکرۂ ہندی/ یہ تذکرہ مابین 1200ھ/1785-86ء و 1209ھ لکھا گیا تھا۔ ا رک دیباچہ دستور الفصاحت/83-84

[4] ابوطالب: خلاصۃ الافکار (قلمی) بحوالہ معاصر 4 نیز قلمی نسخہ دہلی یونیورسٹی لائبریری۔

[5] در سال ہزار و دو صد و دوازدہ بملاقات شریف خواجہ محمد علی تمنا... در لکھنؤ بخانۂ خان صاحب عبدالقادر خان بہادر اتفاق افتاد۔ عمان المعانی (قلمی) بحوالہ نقوش ادب عالیہ نمبر)

[6] ملاحظہ ہو چار شربت (نولکشور) نیز ہفت تماشا (متن فارسی) طبع نولکشور 1805ء، وصدیق حسن خاں۔ شمع انجمن/390 (طبع بھوپال)

[7] ہفت تماشا (باب دوم) قتیل نے لکھا ہے کہ عماد الملک کی وفات کے بعد بھی کچھ زمانے تک کالپی میں رہا۔

تھا، قتیل نے تصنیف کیا [1]

قتیل نے ایک مشاعرے کی روداد خواجہ امانی کو لکھی ہے۔

"احوال مشاعرہ برین منوال است کہ چوں۔ دنہا یے موسم سرماکم عمر است و تا فارغ شدن مردم از طعام و طے کردن مسافت تا باین جا، و انعقاد پذیرفتن صحبت سہ پہر می زند، ازین جہت صحبت دیروزہ بہ نصف شب کشیدہ۔ جابجا دروازہ ہا بند شدہ بود۔ غنچۂ میر صاحب باوصف خوش گوئی بدستور بودہ است۔ تمام جسم مبارک ایشاں رعشہ داشت و آواز راہم کسے نمی شنید۔ لیکن من و خدا کہ غزلہا خوب گفتہ بودند" [2]

ظاہر ہے یہ میر کی وفات (۱۸۱۰ء - ۱۲۲۵ھ) سے دو تین سال قبل کی روداد ہے۔ ۱۲۲۹ھ (مطابق ۱۸۱۳-۱۴ء) میں جب عبدالقادر خاں غمگین [3] نے لکھنو کا سفر کیا، اس وقت بھی مرزا قتیل محفل سخن میں نظر آرہے ہیں۔ غمگین نے لکھا ہے:

"روزے در محفل مشاعرہ کہ در آن ایام بخانہ مرزا جعفر [4] می بود رفتم، مرزا

---

[1] دریائے لطافت کا فارسی متن سب سے پہلے مطبع آفتاب عالم تاب مرشد آباد سے ۱۲۶۶ھ میں شائع ہوا تھا۔ انجمن ترقی اردو سے دو بار چھپی ہے۔ پہلی طباعت ۱۹۱۶ء دالناظر پریس لکھنو، پر مولوی عبدالحق کا مقدمہ ہے۔ طبع ثانی (مترجمہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔

[2] معدن الفوائد، ۵۴

[3] تفصیل کے لیے رجوع شود: احمد علی شوق: تذکرہ کاملانِ رامپور، ۲۳۴-۲۳۵، امیر مینائی: انتخاب یادگار، ۲۰۱۔ امتیاز علی عرشی (دیباچہ)، دستور الفصاحت ۱۳۱-۹۔

[4] مرزا جعفر، مرزا فخر الدین احمد خان بہادر کا عرف ہے۔ یہ نواب آصف الدولہ کے نائب سرفراز الدولہ حسن رضا خاں کے بہنوئی تھے۔ شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ باقی ص ۱۱۹ پر

محمد حسن متخلص بہ قتیل و مصحفی و میر نصیر دہلوی در آں زمرہ سرکردہ بشمار می آمدند و شیخ امام بخش ناسخ از دوران ایام روز افزونی و ناموری درین کار بود[1] ۱۲۳۱ھ مطابق ۱۸۱۵ء میں دوبارہ کالپی کا سفر کیا[2]

۲۳ ربیع الثانی ۱۲۳۳ھ مطابق ۲ مارچ ۱۸۱۸ء روز شنبہ[3] کو قتیل نے استسقا[4] میں مبتلا ہو کر لکھنؤ میں وفات پائی۔ مؤلف صحائف شرائف کا مستخرجہ مادۂ تاریخ یہ ہے[5]

حاشیہ بقیہ ص ۱۱۸ - ان کے گھر بڑی ستھری محفلیں شاعری کی ہوتی تھیں۔ ان کے بیٹے افتخار الدولہ لہ معین الملک مرزا قمر الدین احمد خان بہادر صولت جنگ قتیل کے شاگرد تھے (دستور الفصاحت ص ۱۲۰ - ۱۲۱، نیز ملاحظہ ہوں۔ نجم الغنی - تاریخ اودھ (ج ۴) ص ۱۱۴ - ۱۱۵ وحید مصحفی ؛ یاض الفصحا ۲۵۹/۶۹ - وقائع عبد القادر خانی (طبع کراچی)، سوانحات اودھ جلد دوم نیز حواشی تذکرہ ابن امین اللہ طوفان - از قاضی عبد الودود۔

[1] روزنامچہ عبد القادر غمگین رامپوری (قلمی نسخہ کتب خانہ حبیب گنج) اس کی نقل رضا لائبریری رامپور میں ہے۔ اب کراچی سے اردو ترجمہ، حواشی کے ساتھ شائع ہو گیا ہے جسے جناب محمد ایوب قادری نے مرتب کیا ہے۔

[2] منظہر العجائب / دیباچہ (طبع نولکشور)۔ نیز قتیل نے اپنی عمر کے آخری پندرہ سال میرزا سکندر شکوہ کے مختار کار میرزا شجاعت علی خاں کی معیت میں بسر کیے تھے۔ اور ایک مختصر سے وقفے کے لیے وہ کالپی گئے تھے۔ (نشتر عشق قلمی)

[3] عاشقی: نشتر عشق جلد دوم (بعض تذکروں نے قتیل کا سال وفات ۱۲۴۰ھ بتایا ہے جو مثلاً نتائج الافکار / ۵۲۵، شمع انجمن / ۳۹۰ یہ بالکل غلط ہے۔

[4] عبرتی: ریاض الافکار (قلمی) ق ۵۳۔ الف نیز زخمی - انیس العاشقین (قلمی)، بحوالہ معاصر ۴ -

[5] عاشقی: نشتر عشق جلد دوم۔ تقویم ہجری و عیسوی کی رو سے ۲۳ ربیع الثانی مطابق ۲ مارچ ہوتی ہے۔ لیکن دن دوشنبہ کا آکر پڑتا ہے تذکرہ میں صریحاً شنبہ آیا ہے۔ (باقی بر صفحۂ آیندہ)

طبع من از دوات و کلک گزشت — بہر تاریخ امتحان سخن
خامہ بنوشت بر سر کاغذ — مردہ آہ عیسیٰ زمان سخن (۱۲۴۳)
عسکری مدح او چساں گویم — ہست الکن مراز بان سخن

دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں سرکاغذ (کاف) کے اعداد کا تعمیہ ہے قتیل کے شاگرد خواجہ امانی نے " داد نورے بمزار و بجہاں تاریکی " سے تاریخ نکالی تھی[۱] لیکن اس سے ۱۲۳۱ھ برآمد ہوتے ہیں۔ غالباً اس مصرع کے اول میں تعمیہ رہا ہوگا۔

قتیل کی معنوی اولادیں تو آج بھی زندہ ہیں جسمانی اولاد کوئی نہیں ہوئی کیوں کہ اس نے تمام عمر تجرد اور آزادگی میں گزار دی[۲] مختلف شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عاشق مزاج اور اوباش قسم کا انسان تھا۔ اس دور کے اودھ میں طوائف بھی زندگی کے آداب میں جزو تکمیلی کی حیثیت رکھتی تھی قتیل بھی ان " لولیان شوخ " کی عشوہ فروشیوں سے بہرہ اندوز ہوتا تھا۔ عاشقی کہتا ہے " ہمیشہ با یک کس تعلق خاطر می وارد گاہے می شود کہ بر یک محبوب اکتفانہ کردہ با دو سہ کس تعلق خاطر می دارد"[۳]

(حاشیہ بقیہ ص ۱۱۹) ـــه صحائف شرائف (قلمی) بحوالہ معاصر ۴ (اس کا ایک مخطوطہ سنٹرل اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں بھی ہے، معدن الفوائد کے آخر میں (۹۴۰) قتیل کی ایک غزل درج ہے جس کا مقطع ہے: مسلمانان مسلمانش مگوئید قتیل کافر ایمائے ندارد، اس کے دوسرے مصرعے کرامت علی اظہر نے تاریخ وفات برآمد کی تھی جسے میر ناصر علی نے تضمین کیا تھا۔

[۱] صحائف شرائف حوالہ ماسبق۔ [۲] ابو طالب: خلاصۃ الافکار (قلمی)، عاشقی: نشتر عشق ج ۲ " بجردان جہاں و آزاداں زمان راطرز مجردی و آزادی آموخت "، زخمی: انیس العاشقین (قلمی)، بحوالہ معاصر ۴۔

[۳] عاشقی: نشتر عشق ج ۲

اس کے مدفن کا کچھ سراغ نہیں ملتا۔ غالباً حوادث کی آندھیوں نے ایک قلندر کا تبرک سمجھ کر آزادوں میں بانٹ دیا۔

مختلف تذکروں کے مطالعے سے قتیل کی سیرت کی جو تصویر بنتی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ آزاد منش قلندر وضع[1]، سادہ طبیعت[2]، موٹا جھوٹا کھانے والا معمولی پہننے والا[3]، عاشق مزاج[4] خوش طبع ظریف وظریف، یارباش ہشاش بشاش، اور سیر وسیاحت کا دلدادہ انسان تھا۔ اس نے اسباب دنیا کبھی فراہم نہیں کیا[5] حتیٰ کہ گھربار اور بیوی بچوں کی قید سے بھی آزاد رہا۔ اس کی ایک قلمی تصویر جو مرقع شعرا میں ہے جعلی ہے[6]

(ب) تصانیف

قتیل کی تصانیف تعداد میں خاصی ہیں۔ اس کی آزادی اور قلندری کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ بایں ہمہ بے پروائی یہ سب آخر لکھی کیسے گئیں۔

مخزن الغرائب کے مؤلف کا بیان ہے کہ "فقیر کسے را در لطافت طبع وجودت ذہن واستقامت عقل ولزوم قناعت وتجرد وتفرد وخوش گزرانیدن مانند الیشان ندیدہ ام۔ وگاہے تلاش دنیا نکردہ۔ خانہ بدوش، قلندرانہ بہ لباس کم بہا زیست می نماید۔ ہرگز در بند شیئی نبودہ، از علاقۂ دنیا تا دوات وقلم کہ از لازمۂ اہل علم است ہمراہ خود ندارد، این ہمہ بے تعلقی از لاچاری نیست)

---

[1] احمد علی: مخزن الغرائب وعاشقی: نشتر عشق بحوالہ معاصر
[2] عاشقی: نشتر عشق ج ۲
[3] احمد علی: مخزن الغرائب (قلمی)
[4] بھگوان داس: سفینۂ ہندی/ ۲،۱
[5] عبرتی۔ ریاض الافکار نیز احمد علی: مخزن الغرائب
[6] رجوع ۔ مرقع شعرا (شائع کردہ رام بابو سکسینہ)

بلکہ باستغنائے طبع است، اکثر بزرگان مثل نواب آصف الدولہ مرحوم و دیگر عزیزان در صدد تربیت او در آمدہ اند و او سرباز زدہ و تن بکار و فرنداده روئیکہ اختیار نمودہ ازاں برنگشتہ[۱]۔

قلندری کا یہ حال تھا کہ "نہ التفات بر قلم تراشیدن دارد نہ بر قط زدن۔ ہنگام تحریر اگر نوک قلم می شکند بہ ہماں قلم دہ خطی نویسد، و خدمت لفافہ تعلق بہ حاضرین دارد۔ الی یومنا ہذا ہمیں نمط زندگی می کند"[۲]۔

اسی لاابالی پن کی وجہ سے قتیل نے کبھی اپنا کلام یکجا کر کے نہیں رکھا۔ عاشقی کا بیان ہے کہ اس کا "دیوان غزل و جنگ نثر قریب پانزدہ ہزار بیت" تھا[۳] مگر اس کے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ دوست اور شاگرد جوڑتے رہتے تھے۔

شاعری اور انشا پردازی کے جو رائج الوقت معیار تھے ان پر قتیل کو حاکمانہ قدرت حاصل تھی۔ احمد علی الہاشمی کا بیان ہے کہ "از علم (کذا)، متداولہ بہرہ دانی و از فنون شاعری نعیبہ کافی دارد و در عروض و قافیہ تاریخ و لغت و انشا در فہم و فراست و دقت طبع درین زمان عدیل و نظیر خود ندارد"[۴] اور بقول عاشقی، "امروز در ہندوستاں کسے ہم زبان آن جناب نیست"[۵]

نظم و نثر میں اس کی ماہرانہ چابک دستی کی دو مثالیں عاشقی نے لکھی ہے جن کا ملخص یہ ہے:

---

[۱] احمد علی الہاشمی: مخزن الغرائب (قلمی) بحوالہ معاصر ۲۔ (اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ حبیب گنج علی گڑھ میں ہے)۔

[۲] آغا حسین قلی خاں عاشقی: نشتر عشق جلد ۲ (قلمی) بحوالہ معاصر ۲

[۳] نشتر عشق حصہ ۲ بحوالہ معاصر ۲

[۴] مخزن الغرائب (قلمی) بحوالہ معاصر ۲

[۵] نشتر عشق حصہ ۲، بحوالہ معاصر ۲

۱- ایک بار مرزا جعفر کے لڑکے کی شادی کے موقع پر شہر کے لوگوں کو شرکت مجلس کا دعوتی رقعہ بھیجنے کی خدمت قتیلؔ کے سپرد کی گئی دعوت کے رقعے کا مضمون ہوتا ہی کیا ہے مگر انھوں نے دو دن میں سو رقعے مختلف الفاظ و عبارت میں لکھ کر پیش کیے اور کہا کہ اگر ایک ہفتے کی مہلت مل جائے تو ایسے ہی آٹھ سو رقعے اور لکھ سکتا ہوں۔

۲- ایک بار سعادت یار خاں رنگینؔ لکھنؤ سے واپسی میں مجھ سے ملنے آئے اور قسم کھا کر بیان کیا کہ ایک بار انشاء اللہ خاں مرحوم نے جو مرزا کے دوستوں میں تھے اور آپس میں ہنسی مذاق بھی ہوتا تھا۔ دو تین دن میں بڑے غور و تامل کے بعد دو تین فقرے بے نقط نثر کے لکھ کر قتیلؔ کو خط بھیجا۔ اگلی صبح کو جب قتیلؔ سے ملاقات ہوئی تو انشاء اللہ نے کہا لہ" دیکھا میں نے کیسا بے نقط رقعہ لکھا تھا؟

لہ کچھ شاعرانہ چشمک اور معاصرانہ رقابت، کچھ انشاءؔ کی کٹ کھنی طبیعت۔ قتیلؔ کو کبھی با وجود دوستی و یک جہتی کے رگیدنے سے نہ چھوڑا اور معمولی اعتراضوں پر اس کی ہجویں لکھ ڈالیں "یک روز بعد نماز ظہر بتلاوت قرآن مجید مشغول بودم آں روز مرزا قتیلؔ ہم در خانۂ من مہمان بود۔ چونکہ تلاوت کردہ بودم لفظ معنا را خواندم، مرزا قتیلؔ لفظ مَعَنا را شنید و گفت معنا یعنی بسکون عین خوب است کہ قاعدۂ عربی مَعْنا است، فوراً کبت گفتم:

کہے جو کہ قتیل صحیح ہے وہ، کہ وہ کھتری ہے اور گدھے کی ہے دُم
کہے وہ جو خدا مَعَنا سو غلط، نہ طریق رشاد کو بھیجے گم
مع ہو جو مضاف تو عین کو جزم ہو، اجی کیوں ہو بھلا وہ کہو مجھے تم
تو مثالیں غلط ہوں یہ سب تمنّیٰ مَعَہا مع من معنا مَعَکُم

(ملاحظہ ہو مرزا عسکری: کلام انشاءؔ شائع کردہ ہندوستانی اکادمی الہ آباد ۱۹۵۲ء)

ایک اور موقع پر قتیلؔ سے لفظ ہجر کے مفتوح یا مکسور ہونے پر بحث ہو گئی تو انشاء نے طویل رقعہ لکھ ڈالا۔

انیسا مشفقا بندہ نوازا   لِمَ حَرَّمتنی تو لا تقبلا ،، (بقیہ ص ۱۲۴ پر)

تم اس کا جواب نہیں دے سکتے۔ قتیل نے" فی الفور قلم اٹھایا اور قرآن کی جو سورتیں اسے یاد تھیں ان کی بے نقط تفسیر لکھنی شروع کر دی اور" درعرصہ یک نیم پاس " نہایت روانی اور سلاست کے ساتھ فیضی کی سواطع الالہام سے بہتر عبارت لکھ ڈالی [1]

یہ واقعہ لکھ کر عاشقی کہتا ہے کہ اسے مبالغہ یا جانبداری نہ سمجھنا حقیقت یہ ہے کہ فیضی تو موجود ہے کوئی اکبر نہیں رہا۔ ظہوری آج بھی زندہ ہے مگر برہان الملک جیسا قدر دانِ کمال نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ قتیل زبان عربی و فارسی و ترکی سے واقفیت رکھتا تھا عاشقی کا بیان ہے کہ وہ عربی اور ترکی میں بات چیت کر سکتا تھا [2]۔ احمد علی کہتا ہے کہ " مہارتِ کلی" حاصل تھی [3] مصحفی [4] اور احمد علی [5] نے فن تاریخ میں اس کی

(حاشیہ بقیہ ص ۱۲۳)

تجھے کہتی تھی دنیا ناف معنی	تو کیوں کر بن گیا مجنوں کا ٹیلا
وہ حجرا ہے جو مجو رآ کے ہمراہ	سو ہے حطلی ہی ہاں مرزا قتیلا
نہ لےجوان قزن کے ہے آخر	وہ ہجو رآ ہے ہوژے خلیلا

لیکن ہجو کا چسکا جب منھ کو لگ جاتا ہے بمشکل سے چھوٹتا ہے۔ انشاء کو اس میں معذور ہی سمجھنا چاہیے (سبحان قلی بیگ سے ان کے معرکے کا حال معدن الفوائد ص ۱، پر ملاحظہ ہو)

[1] عاشقی: نشترِ عشق حصہ ۲ بحوالہ معاصر حصہ ۴ (یہ بیان مبالغے سے خالی نہیں ہے)

[2] عاشقی: نشترِ عشق حصہ ۲ معاصر ۴

[3] مخزن الغرائب ج ۲ (قلمی) بحوالہ معاصر ۴۔ لیکن یہ کہنا یقیناً مبالغہ ہے۔

[4] عقد ثریا / ۴۶

[5] مخزن الغرائب جلد ۲ بحوالہ معاصر ۴۔

دسترس اور قوت حافظہ کی بھی تعریف کی ہے۔ زودگوئی کا یہ عالم تھا کہ "دو ساعت نجومی"[1] میں سو شعر کہہ ڈالتا تھا۔

قتیل کی تصانیف کا مختصر خاکہ یہ ہے:

(۱) **دیوان فارسی:** یہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے، اس کے قلمی نسخے ہندستان کے مختلف کتاب خانوں میں پائے جاتے ہیں اشعار کی مجموعی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ ہے۔

چار شربت: یہ قواعد فارسی مصطلحات، زبان دانی اور محاورہ اہل فارس

---

[1] قتیل نے اردو نثر میں بھی کچھ لکھا تھا، اس کے کچھ اردو خطوط معدن الفوائد (نسخہ قلمی) میں بھی شامل ہیں، جن کا ہم آگے ذکر کریں گے۔ ان کے علاوہ دریائے لطافت میں اردو نثر کے نمونے، خصوصًا ضلع جگت کا بے مثال نمونہ (ملاحظہ ہو دریائے لطافت اردو ترجمہ ص ۷۹، ۳۰ وغیرہ) ہیں۔ البتہ اردو شاعری میں کوئی مستقل کارنامہ نہیں ہے۔ ایک شعر رعایت خاں ناصر نے اپنے تذکرے میں درج کیا ہے (تذکرہ ناصر قلمی، بحوالہ معاصر ۴)، اور تین شعر نسخہ دلکشا جلد ۱ (مخطوطہ بانکی پور) میں دیے گئے ہیں۔ (معاصر ۴) اس میں سے ایک دریائے لطافت کی مثالوں سے ماخوذ ہے۔ (ملاحظہ ہو ص/ ۵، ۱۲) چار شعر مرقع شعراء سے ملتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے ؎

اس زلف کی کیا بات ہے آدھی ادھر آدھی ادھر
پھیلی یہ کالی رات ہے آدھی ادھر آدھی ادھر

مگر اسی مضمون کا ایک شعر:

ہوا ہے مانگ میں دل گم مرا، میں ڈھونڈھوں کدھر
کہ آدھی رات ادھر ہے اور آدھی رات ادھر

تقریبًا نصف درجن شاعروں سے منسوب ہے۔ (ملاحظہ ہو: نقوش۔ جون، ۱۹۵۶ء)

میں ہے اس کی تالیف کا زمانہ غالباً ۱۲۲۰ھ ہے، محمدی پریس لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔

(۳) **نہر الفصاحت**: یہ مختصر رسالہ قواعد زبان فارسی اور اصول بلاغت و انشاء وغیرہ میں ہے اور غالباً پہلی بار رجب ۱۲۶۰ھ میں مطبع مصطفائی کانپور سے شائع ہوا تھا (تعداد صفحات ۳۰)

اس کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ میرا مان علی کا لڑکا میر محمد حسین جب شجرۃ الامانی کے مطالب پڑھ چکا اور اسے انشاء کا ذوق پیدا ہوا تو میرا مان علی نے فرمائش کی کہ اب ایک ایسا رسالہ لکھ دو جو ان مطالب پر مشتمل ہو جو شجرۃ الامانی میں نہیں ہیں۔ چنانچہ قتیل نے یہ نہر الفصاحت لکھی۔ اسے دس موجوں (فصول) میں تقسیم کیا۔ وہ اس کتاب کا نام محمد حسین کی رعایت سے منافع الحسینیہ بھی تجویز کرتا ہے۔

موج اوّل: در تعلیم بعضے چیزہا کہ ترک آں واجب و مستحسن است۔
(خصوصاً ہندستانی فارسی کے نقائص اور وہ الفاظ و محاورات جو ہندی قواعد اور ہندستانی مزاج کے نمونے پر بنا لیے گئے ہیں)

موج دوم: در بیان استعمال افعال
موج سوم: در بیان واجبات و مستحسنات
موج چہارم: در زوائد واجبی
موج پنجم: در بیان مرکبات
موج ششم: در بیان مقدرات و محذوفات
موج ہفتم: در علم بیان
موج ہشتم: در ذکر زبان فارسی
موج نہم: در بیان فرق در اشعار متقدمین و متاخرین و نثر ہندیان و اہل زبان
موج دہم: در تعلیم طریق تحریر نثر

(۴) **معدن الفوائد** یا رقعات مرزا قتیل، خواجہ امام الدین امامی شاگرد قتیل نے ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۷-۱۸۱۶ء[1] میں اپنے موسومہ رقعات جمع کیے تھے۔ اس میں بہت سی کار آمد باتیں قتیل کی زندگی اور اس کے معاصرین کی بابت معلوم ہوتی ہیں۔ یہ کتاب مطبع نولکشور سے ۱۸۸۱ء میں چھپی تھی۔

(۵) **شجرۃ الامانی**۔ یہ میر امان علی کی فرمائش پر ان کے بیٹے میر محمد حسین کے لیے لکھا گیا تھا۔

(۶) **ثمر البدائع**۔ یہ بھی فارسی بلاغت اور فن انشاء سے متعلق ہے ۱۲۶۳ھ میں مطبع محمدی لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔

(۷) **مظہر العجائب**۔ یہ ۱۲۳۱ھ/۱۸۱۶-۱۸۱۵ء میں کالپی میں لکھی تھی اور نولکشور سے شائع ہو چکی ہے۔

(۸) **حدیقۃ الانشاء**۔ یہ ہماری نظر سے نہیں گزری۔ یہ بھی علم نہیں کہ چھپی تھی یا نہیں۔

(۹) **دریائے لطافت**: میر انشاء اللہ خاں انشاء (متوفی ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء) کی

---

[1] اس میں حمد کا حصہ عربی میں، نعت کا ترکی میں، منقبت کا فارسی میں اور تعریف اصحاب اردو میں لکھا گیا ہے۔ چار زبانوں میں اسے تقسیم کرنے کا سبب بظاہر یہ تھا کہ خواجہ امامی نے ان ہی چاروں زبانوں میں قتیل کے رقعات بھی فراہم کیے تھے۔ لیکن مطبوعہ نسخے میں صرف فارسی رقعات چھپے ہیں۔ معدن الفوائد کے دو قلمی نسخے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنوی کے پاس ہیں۔ ان میں پانچ خط اردو زبان میں بھی ہیں۔ انہیں ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے مختصر تمہید کے ساتھ شائع کر دیا تھا (ملاحظہ ہو نور الحسن ہاشمی، مرزا قتیل کے غیر مطبوعہ اردو خطوط رسالہ نیا دور، جلد ۱۹، شمارہ ۳ (جون ۱۹۶۴ء)۔ مطبوعہ نسخے میں فارسی رقعات کی تعداد ۱۸۲ ہے، ان میں کہیں کہیں ترکی عبارت بھی فارسی کے ساتھ آ گئی ہے۔

تالیف ہے جو ۱۲۲۳ھ/۱۸۰۷ء میں لکھی گئی۔ اس کا آخری حصہ جو معانی و بیان و بدیع و عروض و منطق سے متعلق تھا؛ قتیل نے لکھا ہے۔ یہ حصہ مطبوعہ کتاب (مترجمہ برجموہن دتاتریہ کیفی طبع انجمن ۱۹۳۵ء کے صفحہ ۳۵۹ سے شروع ہوتا ہے۔

(۱۰) **ہفت تماشا**: یہ قتیل کی زندگی کے آخری ایام کی تصنیف ہے۔ اور اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت اہم کتاب ہے۔ یہ مارچ ۱۸۷۵ء میں مطبع نولکشور سے چھپی تھی۔ اس کے مطالب کا تعارف یہاں قدرے تفصیل سے کرایا جائے گا۔

ـــــــ ۳ ـــــــ

(ج) ہفت تماشا ہفت تماشا قتیل کی تصانیف میں سب سے اہم اور قابل قدر کتاب ہے۔ اس کی شان نزول قتیل نے دیباچے میں یوں بیان کی ہے۔

"محمد حسن قتیل کہتا ہے کہ نواب سعادت علی خاں کے عہد میں[1] مرزا محمد حسین کربلائے معلیٰ سے لکھنؤ تشریف لائے تو محمد آفرین علی خاں کے توسط سے حضور پر نور نے صندوق نقرہ کے ساتھ انھیں ۱۲۲۶ھ/۱۸۱۱-۱۲ء میں پھر واپس بھیجا۔ میں ان کے محامد آقا محمد صادق خاں صفا ہانی اور آقا ابوالحسن خاں قزوینی کی زبانی سن چکا تھا، اور ان دونوں کے ذریعے سے وہ بھی مجھ سے غائبانہ متعارف تھے۔ اسی وسیلے سے دو تین مرتبہ ان کی خدمت میں عریضہ بھیجا اور جواب پایا۔ انہوں نے حکم دیا کہ میں ہندوؤں کا احوال اور اس فرقے کی رسوم۔ نیز قدیم مسلمانوں کے اوضاع و اطوار اور نو مسلموں کے حالات لکھوں، چنانچہ میں نے تعمیل ارشاد کی اور اس کا نام ہفت تماشا رکھا۔"[2]

---

[1] نواب سعادت علی خاں ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء کو وسادۂ آرائے ریاستِ اودھ ہوئے اور ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء تک مسند نشین رہے ملاحظہ ہو نجم الغنی: تاریخ اودھ جلد چہارم ص ۱ تا ۱۰۸ [2] دیباچہ ہفت تماشا صفحات ۲ تا ۵ (یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے۔ مطالب کی تلخیص ہے)۔

بظاہر مرزا محمد حسین نے اس کتاب کی فرمائش یوں کی ہو گی کہ قتیل خود ایک معزز ہندو گھرانے سے علاقہ رکھتا ہے۔ ہندستانی دیومالا اور رسوم مذہبی سے اچھی طرح واقف اور مع ہذا فارسی انشاپردازی پر قادر ہے۔ وہ ایک ایسی کتاب لکھ سکے گا جس سے تازہ وارد ولایتی حضرات کو ہندستان کے مذاہب اور مختلف فرقوں کے رسوم و عقائد سمجھنے میں مدد مل سکے لیکن نہ مرزا محمد حسین نے سوچا ہو گا، نہ مرزا محمد حسن (قتیل) نے کہ آنے والے زمانے میں یہ ایک اہم تاریخی و معاشرتی دستاویز بن جائے گی۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے ہندستان کی معاشرت پر اس کتاب میں اتنا قابل قدر مواد محفوظ ہے، جو اس عہد کی اور کسی کتاب میں نہیں ہے۔ اس کی مدد سے اس عہد کے شمالی ہند کی سوسائٹی کا پورا مرقع تیار ہو سکتا ہے۔

اس میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، سات تماشے (یعنی ابواب) ہیں:

پہلا باب: سمارتوں (یعنی اہل تقلید) کا مذہب اور اس کے بارے میں تحقیقات۔

دوسرا باب: انسان کی آفرینش کا بیان۔
تیسرا باب: ہندو فرقوں کے عقائد
چوتھا باب: ہندوؤں کے متبرک دنوں اور تہواروں کا بیان۔
پانچواں باب: ہندوؤں کے رسوم و رواج
چھٹا باب: ہندستانی مسلمانوں کی معاشرت اور رسوم و رواج
ساتواں باب: بعض عجائب و غرائب

ان ابواب میں ہندستانی دیومالا کی روایات، جہلاء اور عوام کے عقائد، عوامی رسمیں، نذر و نیاز، باہمی روابط، یا خود قتیل کی زندگی اور ذہنی افتاد سے متعلق کارآمد معلومات ملتے ہیں۔

قتیل کی اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض اندھے تقلیدی عقائد ہی نہیں

رکھتا تھا، بلکہ بہت سے امور میں اس کی آزادانہ رائے تھی، جو اس نے عقلی دلائل کی روشنی میں قائم کی تھی۔ ایسی آرا کے اظہار میں وہ پوری بے تکلفی سے کام لیتا ہے حتیٰ کہ خود کھتری گھرانے سے تعلق رکھتے ہوئے بھی وہ یہ لکھتا ہے کہ "اس زمانے میں اصیل النسل کھتری روئے زمین پر باقی نہیں رہے ہیں اور جس قدر بھی ہیں وہ لوگ برہمن کے نطفے سے ہیں کیوں کہ اس جماعت کے مردوں کے قتل کے بعد ان کی بچی ہوئی عورتوں کو پرس رام نے اپنے بھائیوں کے حوالے کر دیا تھا اور ان کے بطن سے جو اولاد وجود میں آئی وہ برہمن کے بجائے کھتری کے لقب سے ملقب ہوئی (تماشائے اول)

اس عہد کی معاشرت میں شرافت اور حسب و نسب کے معیار بہت سخت اور تقلیدی قسم کے تھے۔ ایک تو مسلمانوں میں پہلے ہی سے عرب کے تفاخر نسبی کا اثر تھا۔ پھر ایرانی حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے تو وہ بھی کسی سے کم نہ تھے۔ انھوں نے عربوں کے نسب میں بھی کیڑے نکال دیے۔ چنانچہ خلفائے عباسیہ کے زمانے میں جب عربوں کے خلاف شعوبیہ تحریک نے زور پکڑا تو متعدد کتابیں مثالب العرب (عربوں کی برائیاں) کے موضوع پر وجود میں آگئیں[1] اگر عرب اپنی نسل اور نسب پر اتراتے تھے تو عجم والے بھی اپنی شوکتِ باستان پر نازاں تھے۔ یہ دونوں اثرات لے کر مسلمان ہندستان پہنچے تو یہاں کے باشندے ان سے بھی ایک قدم آگے نظر آئے یعنی انھوں نے پوری انسانیت کو اونچ نیچ کے خود ساختہ معیاروں سے تقسیم کر رکھا تھا۔ اور خود خلاصۂ کائنات بنے بیٹھے تھے۔ یہاں پیشہ وروں کی بڑی جماعت "شودر" کا درجہ رکھتی تھی۔ اہلِ ہنود، مسلمانوں کو بھی شودروں کی صف میں جگہ دیتے[2] چونکہ اسے مذہبی عقیدے

---

[1] تفصیل کے لیے: محمد نبیہ حجاب، مظاہر الشعوبیہ فی الادب العربی (مصر ۱۹۶۱ء) نیز احمد امین۔ ضحی الاسلام۔ [2] ملاحظہ ہو ہفت تماشا (باب دوم)

کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ اس لیے مسلمانوں نے کبھی اپنی اس عزت افزائی پر ہندستان والوں سے تعارض نہیں کیا، اور اسی حیثیت میں رہنا منظور کرلیا۔ نسل انسانی کی یہ تجدید اور ذاتوں کی تنگ نظری کے ساتھ تقسیم، ہندستان میں مسلمانوں کے قدم جمانے میں یقیناً بہت معاون ہوئی ہو گی۔[1] چنانچہ انھیں شودروں کے ایک بڑے طبقے کی ہمدردی حاصل ہوگئی جنھیں ابھی تک سوسائٹی نے بنیادی معاشرتی حقوق سے بھی محروم کر رکھا تھا۔ مساوات کا سبق انھوں نے پہلی بار مسلمانوں سے پڑھا اور اس کا آنند محسوس کیا۔ اگرچہ یہاں کے "ذات پات" کے تصورات سے خود مسلمان بھی کسی نہ کسی درجے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس عہد کے مسلمانوں میں بھی نسب کے ساتھ ساتھ حسب (پیشے) پر بہت مبالغے کے ساتھ زور دیا جاتا تھا۔ اگر کسی ایسے خاندان کا شخص ترقی کر کے سماجی امتیاز حاصل کر لے جس کے رشتے دار (مثلاً کلال رہے ہوں' (جن کا حسب یہ تھا کہ یا تو بادشاہ کی ذاتی خدمت سے متعلق ہوتے تھے، یا فراش اور حاجب وغیرہ ہوتے تھے، یا شراب کشید کرتے اور بیچنے کا کام کرتے تھے، یا بہت ہی غریب ہوئے تو پانی بھرتے تھے) تو وہ

---

[1] ELLIOT & DOWSON VOL II INTRODUCTION BY PROF. HABIB, .

متی کلال کا واقعہ ذہن میں رہے جو شاعر تھا اور جہانگیر کا حاجب بھی تھا۔ اس نے نورجہاں سے سفارش کرائی کہ شہنشاہ میرے کلام کو شرف سماعت عطا فرمائیں۔ جہانگیر نے اسے موقع دیا جب اس نے یہ شعر پڑھا:

متی بہ گریہ سرے ذار دلے نصیحت گر — کنارہ گیر کہ امروز روز طوفان است

توجہانگیر نے اسے پڑھنے سے روک دیا اور طنزاً کہا کہ پیشے کی رعایت یہاں بھی نہ چھوڑی! (سرخوش: کلمات الشعراء ص ۱۰۹)

اپنے خاندان کو چھپانے لگتا تھا۔ مثلاً مصحفی کلال فرقے سے تعلق رکھتا تھا[۱]
اس نے اپنے ہم چشموں سے اپنے خاندان کا حال تا بمقدور مخفی رکھا اور ایک
موقع پر عبدالقادر رامپوری کو یہ اطلاع دی کہ میں تم گڑھ میں پیدا ہوا تھا[۲]
گر میرا خیال ہے کہ اس نے مصلحتہً غلط بیانی سے کام لیا۔ اس لیے کہ عبدالقادر
رامپوری امروہے کے خاندانوں سے ذاتی طور پر واقف تھا اور وہ ایک
زمانے میں امروہے کا تھانے دار بھی تھا[۳] اسی طرح میر سیادت کے مدعی ہیں۔
ممکن ہے ماں کی طرف سے وہ فاطمی ہوں مگر ان کے ہم عصروں[۴] نے ان کے

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ راقم الحروف کا مضمون ذکر مصحفی، مطبوعہ رسالہ برہان دہلی ۱۹۵۶ء

[۲] وقائع عبدالقادر خانی

[۳] وقائع عبدالقادر خانی

[۴] مثلاً میر کی آپ بیتی ۹۸/ نیز دلی کالج میگزین (میر نمبر) مرتبہ راقم الحروف، صفحات ۲۸،
۵۵، ۵۶ (کلیات میر میں بھی ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں سیادت کا دعویٰ کیا گیا ہے۔
یہ بات قابل لحاظ ہے کہ میر نے اپنے سوتیلے بھائی محمد حسن کے نام کے ساتھ کہیں میر نہیں لکھا۔
اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید ان کی ماں فاطمی ہوں، مگر اپنے باپ کو بھی وہ "میر محمد علی" لکھتے
ہیں۔ میر کی آپ بیتی (طبع اول/ ۹۱)

مثلاً سودا کا یہ قطعہ:

بیٹھے تنور طبع کو جب گرم کرکے میر — کچھ شیرمال سامنے کچھ نان کچھ پنیر
میرتی کے اب تو سارے مصالح ہیں مستعد — بیٹا تو گندنا ہے اور آپ کو تھ میر

آب حیات طبع دہم/ ۲۰۴)

یا قائم چاندپوری کے دیوان (قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن) میں یہ رباعی ملتی ہے:

روٹی کے لیے کہلائے تم بھڑجی میر — کہیے تو بجا ہے آپ کو خبز خمیر
پر میر ہوئے یہ اس طرح کے جیسے — ساگوں میں ہے کوتھ میر اگوں میں ہیر

(رباعی ص ۱۳۳)

حسب پر ایسا طعن کیا ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ ان کے خاندان میں کسی وقت نان بائی کا پیشہ ہوتا تھا۔ قتیل نے اس زمانے کے ان تصورات کو قدرے تفصیل سے پیش کیا ہے اور بظاہر وہ ان مروّجہ اقدار کا مخالف نہیں ہمدرد ہے۔

وہ کہتا ہے کہ "بعض امیر مرثیہ خوانوں کو بھی محرم کے سوائے اپنی مجلس میں بٹھانے کے لائق نہیں سمجھتے"۔ حالانکہ محرم کے دنوں میں ان روضہ خوانوں کی بڑی آؤ بھگت کرتے تھے۔

سمارتوں کے بیان میں قتیل نے یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ ان کی بت پرستی ایسی نہیں ہے کہ وہ بتوں کو خدا یا خدا کا مظہر سمجھتے ہوں .... عقیدہ خواص ہی کا قابلِ اعتبار ہے .... لیکن اس فرقے کے عوام یقیناً بتوں کو خدا سمجھتے ہیں ..[1]

اس کے بعد فرقہ چارواگ کا ذکر ہے، جو عبادت بدنی و مالی کا معتقد نہیں ہے، یہ مسئلہ مسلمانوں میں بھی نزاعی رہا ہے۔ چنانچہ سر سید احمد خاں نے اس سلسلے میں متعدد مضامین لکھے ہیں۔ وہ بھی عبادت مالی کے قائل نہیں تھے۔ پھر سرآدگی کا بیان ہوا ہے جس کے یہاں اہنسا کا عقیدہ

حاشیہ بقیہ ص ۱۳۲) خود میر نے بھی ذکر میر میں کبو دجامہ کے سیار بہ پز (نہاری فروش) کا قصہ عجیب سے رمزیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اگرچہ کوئی دستاویزی ثبوت ملنا مشکل ہے لیکن میرا خیال یہی ہے کہ میر کے خاندان میں کچھ لوگ اس پیشے سے متعلق رہے ہوں گے۔

[1] ہفت تماشا (باب دوم)

[2] مرزا مظہر بھی ان صوفیہ میں ہیں جو ہندوؤں کی بڑی جماعت کو "مشرک" نہیں سمجھتے۔ کلمات طیبات مکتوب چہاردہم۔

نہایت مضحک صورت اختیار کر گیا ہے ۔ آج یہ بات غور وفکر کا سنجیدہ موضوع ہے کہ ہمارا ملک، جہاں ایسے لوگ بھی آباد ہیں جو جیوہتیاء سے بچنے کے لیے ناک پر کپڑا باندھتے ہیں اور جو نظریاتی حیثیت سے دنیا کے تمام ممالک سے زیادہ عدم تشدد کا حامی ہے، اعداد وشمار کی روشنی میں یہاں کے باشندے دنیا کے سب سے زیادہ متشددانہ عوام ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان نظریات پر اتنے مبالغے سے زور دینے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہندستانی باشندوں کو اپنے اس امتیاز کا احساس رہا ہے حال ہی میں ایک روسی پروفیسر نے ایسے اعداد وشمار پیش کیے تھے جن میں بتایا گیا تھا کہ ہندستان میں عوامی بلووں کا سالانہ اوسط دنیا کے دوسرے سب ممالک سے زیادہ ہے ۔ ایسی ہی بات ایک مستشرق نے ایرانیوں کی نسبت لکھی ہے کہ فارسی میں اخلاقی شاعری کی جتنی مقدار ہے اور جس بڑی تعداد میں، خلاقیات پر کتابیں لکھی گئی ہیں، اور ان میں جابجا سچائی ، راستی اور ایمانداری کی تبلیغ میں جو مبالغہ کیا گیا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ ایرانی باشندوں میں، ان صفات کا دوسری سب قوموں کی نسبت بہت زیادہ فقدان ہے ۔

ممکن ہے یہ تاریخی عمل ہو یا سیاسی اور اقتصادی صورتِ حال کا ردِّ عمل، یا جغرافیائی اثرات کا کرشمہ، کہ ہندستانی فلسفے کے تمام مذاہب عدم تشدّد کی کیلی پر گھومتے ہیں۔ اب ہمارے زمانے میں گاندھی جی بھی ان نظریات میں اتنے متشدد تھے کہ انھوں نے ایک بار دوسری جنگ عظیم کے دوران میں یہ بیان دے دیا تھا کہ ہمارے ملک پر اگر جاپان نے حملہ کیا تو ہم سرحد پر ہار لے کر کھڑے ہو جائیں گے ۔ اور ان کا استقبال کریں گے! ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم اپنی اہنسا کی پالیسی پر بدستور قائم رہیں ۔ مگر مولانا آزاد کا کہنا ہے کہ انھوں نے گاندھی جی کے اس بیان پر احتجاج کیا اور اس کی تردید شائع کرائی تھی[۱]

AZAD: INDIA WINS FREEDOM. PP 31, 36 ۱

مسلمانوں کے زمانۂ اقتدار میں، عالمی قانون کا تقاضا تھا، کہ محکوم قومیں ان کے قریب آنے کی کوشش کریں۔ کلچر سے بڑھ کر یہ بات مذہبی عقائد تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ اسی کتاب میں آپ حسینی برہمنوں کا حال دیکھیں گے[1] کہ انھوں نے اپنا ناتا کس طرح واقعات کربلا سے جوڑ دیا ہے۔ یا جے پور کے اولوالعزم مہاراجہ کا رشتہ یوں قائم کیا ہے کہ ان کے اجداد نوشیروان عادل کی نسل سے تھے اور راجپوتوں سے ہمشیر زادگی کا رشتہ ثابت کرتے ہیں اور اسے حضرت شہر بانو کے واسطے سے کہتے ہیں جنھیں حضرت علی اصغر کی عجمی والدہ سے نسبت ہمشیر زادگی تھی۔۔ .... یہ راجپوت نوشیرواں عادل کی نیک نامی اور اسلام کے طنطنے پر نظر رکھتے ہوئے اس فرضی قرابت کا اقرار کرتے ہیں اور اسے آخرت کا سرمایہ سمجھتے ہیں"[2]

ایسی روایات بھی زبان زد ہو جاتی تھیں کہ کربلا میں حضرت حسین کی حمایت کرنے کے لیے ہندستان سے ساہس راؤ نامی ایک شخص بھیجا گیا تھا۔ پریم چند نے اسے اپنے ڈرامے کربلا کا کردار بنا دیا ہے[3]۔ تاریخی اعتبار سے تو یہ سب خرافات ہیں۔ لیکن ایسی روایتوں کے بین السطور میں، ہم بہت کچھ پڑھ سکتے ہیں۔

اسی ذیل میں خنوی فرقہ بھی آتا ہے جس کا ذکر قتیل نے باب دوم میں کیا ہے "ان کی عادت ہے کہ رمضان کا چاند دیکھ کر عید تک خوب نماز پڑھیں گے۔ ہندو مذہب کے برت بھی رکھیں گے۔ محرم میں تعزیہ داری کریں گے اور کالکاجی کے میلے میں جا کر کالکا مندر کے سامنے ناچیں گے بھی متھرا اور

---

[1] اس فرقے کے لوگ خال خال ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ ہندوؤں کے آگے کبھی دست سوال دراز نہیں کرتے۔ مسلمان جو کچھ دیتے ہیں اس پر بسر اوقات کرتے ہیں۔

[2] ہفت تماشا (باب دوم)

[3] ملاحظہ ہو: پریم چند کے ڈرامے از راقم الحروف مشمولہ دید و دریافت نیز زمانہ کانپور پریم چند نمبر۔

[redacted]

بندرابن میں آرتی اور اشلوک پڑھیں گے۔ گائے اور سور کے گوشت سے پورا پورا پرہیز کریں گے، وغیرہ۔ ان کے نام مسلمانوں جیسے ہی ہیں قتیل نے ان کی ابتداء کے بارے میں خیال ظاہر کیا ہے کہ انھوں نے جبراً اکراہ سے اسلام قبول کیا ہوگا[1] اور بعد میں ان کے لیے ہندوؤں میں بھی گنجایش نہیں رہی مجبوراً آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر رہ گئے۔ یا پھر شک اور جہالت میں گرفتار ہیں" یہ اسباب بھی ہو سکتے ہیں؛ لیکن میں اس کی تعبیر یوں کروں گا کہ ہندو معاشرے میں انصاف اور سماجی مساوات نہ ملنے کی وجہ سے انھوں نے اسلام قبول کیا، چونکہ ان کو اتنی تعلیم نہ مل سکی کہ وہ ہزاروں برس کے خرافی تصورات اور تہذیبی وسماجی معمولات کو بھی بدل سکیں۔ اس لیے انھوں نے مذہبی عقیدوں میں لچک پیدا کرلی۔ یعنی ان کا مذہب اسلام رہا اور تہذیب ہندو۔ آج بھی ہندوستان کے بیشتر دیہاتوں میں ایسے لوگ مل جائیں گے جو باعتبار خاندان مسلمان ہیں لیکن تمام تر ہندو مذہب میں رنگے ہوئے ہیں[2] خصوصاً ان علاقوں میں جو مسلمانوں کے تہذیبی اور علمی مراکز سے دور جا پڑے ہیں، جیسے راجستھان، گجرات، مدھیہ پردیش وغیرہ۔ یہ لوگ صحیح معنوں میں دو مختلف

---

[1] قتیل نے چھٹے باب میں یہ بھی لکھا ہے کہ ڈولے کی رسم جو اکبر کے زمانے سے شروع ہوئی جبرواکراہ کی وجہ سے تھی ممکن ہے ابتدا میں ایسا ہی ہو، لیکن یہ رسم تو بہادر شاہ ظفر کے عہد تک نبھائی گئی ہے جس غریب کا اختیار اپنے اوپر بھی نہ رہا تھا۔ میں اسے مخلوط کلچر کی دین سمجھتا ہوں۔ اس میں سیاسی قوت یا بالادستی کے خوف کو کچھ دخل نہ تھا۔

[2] اسلام کے ہر دور میں اور ہر علاقے میں یہ ہوا ہے کہ تبدیل مذہب کرنے والے اپنا تہذیبی اور تاریخی سرمایہ لے کر اسلام میں داخل ہوئے اور پھر انھوں نے اسلامی عقائد وتصورات کو ان سے مسخ یا متاثر کیا ہے۔ اس کا نہایت دل چسپ تجزیہ پروفیسر احمد امین المصری نے اپنی کتاب فجر الاسلام اور ضحی الاسلام میں کیا ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد اشرف کی آپ بیتی بھی ملاحظہ فرمایئے جو نقوش (لاہور) کے آپ بیتی نمبر میں شامل ہے

تہذیبوں کے سنگم کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ نمونہ اچھا ہے یا اسے مذموم سمجھا جائے۔

قتیل نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کے اور فرقے بھی ایسے ہیں جو مسلمانوں کے رہن سہن اور خوراک اور پوشاک کو پسند کرتے ہیں اور ان کی گفتگو سے متاثر ہو کر یا اہلِ اسلام کی شان و شوکت دیکھ کر متحیر ہو جاتے ہیں۔ اور جوق درجوق صوفیوں کی اطاعت میں آجاتے ہیں۔ ان میں بہت سے لوگ شیعوں کی حکومت کے باعث تشیع کی طرف جھکتے ہیں۔ یہ الزام تو بہت پرانا ہو چکا کہ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا، ہندستان کی حد تک تو یہ بہت آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مغلوں کی شائستگی اور کلچر کی برتری نے یہاں کی قوموں کو تبدیلِ مذہب پر آمادہ کیا۔ اس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہوگی۔

قتیل نے انگریزوں کے ملکی نظم و نسق کی تعریف کی ہے۔ اس سے بالواسطہ دیسی انتظام کی خرابیوں کا علم ہوتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ شاہی وقتوں میں اکثر سنیاسیوں اور بیراگیوں میں کشت و خون ہوتا تھا مگر اب "صاحبان عالی شان انگریز بہادر کے نظم و نسق کی وجہ سے یہ لوگ سر نہیں اٹھا سکتے ... یہ رعب خداداد ہے ورنہ اتنی بڑی جماعتوں سے کسی قدیم عادت کا چھڑا دینا محالات میں سے تھا۔[۱]

دوسرے موقع پر اس نے انگریزی ڈاک کے نظام کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس میں خط ہرگز گم نہیں ہوتا، دیسی ڈاک میں ضائع ہو جاتا ہے۔"
خطِ احدے در ڈاک انگریزی تلف نمی شود و اگر مکتوب الیہ کہ خط برائے اوست ہم بجائے حرکت کند باز خط را ضائع نمی کنند یا بمکتوب الیہ می رسد، اگر در ہمسایہ قرب و جوار تردد دارد، و الّا ہر کہ نوشتہ است پس می دہند۔ بخلاف ڈاکِ جناب

۱؎ ہفت تماشا (باب دوم)

عالی کہ ہمیشہ در چہار خط دو خط بیادی رود ۱

اس طرح ناگے سنیاسیوں کا بیان پڑھ کر یہ سمجھ میں آجائے گا کہ امرائے ریاست ان لوگوں کو اپنے مقاصد کے لیے کیوں ملازم رکھتے تھے مثلاً شجاع الدولہ کی سرکار ہی میں کئی سو ناگے ملازم تھے ۲۔

ویدانتیوں کے ذیل میں قتیل نے صوفیہ کا بھی ذکر کیا ہے اور کہتا ہے کہ "تحفۂ اثناعشریہ کے مصنف مولوی عبدالعزیز کے والد شاہ ولی اللہ محدث اپنی تصنیف موسومہ بہ نور العینین فی تفضیل الشیخین میں لکھتے ہیں کہ علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے اس جماعت کو قتل کر دیا تھا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ لوگ باطل کے پیرو تھے۔ کیوں کہ علی کا انھیں قتل کرنا اس جماعت کے عقائد کے باطل ہونے کی قوی دلیل ہے۔ اصل خواہ کچھ ہی ہو اس کا مفہوم یہی ہے جو میں نے لکھا ہے" ۳

صوفیہ کے بارے میں قتیل کی رائے سنی سنائی معلوم ہوتی ہے وہ محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم کے حوالے سے لکھتا ہے کہ "اس جماعت کا ہر فرد اپنے تئیں خدا سمجھتا ہے" یہ غلط محض ہے اسی طرح یہ قول کہ "صوفیوں کے اعمال وہی ہیں جو بیدانتیوں کے اعمال ہیں" بہت عامیانہ انداز کا ہے۔ فلسفہ بیدانت کا اثر ہندستانی صوفیہ کے افکار پر ضرور پڑا ہے لیکن اس میں بہت زیادہ مماثلت مغلوں کے دور میں پیدا ہوئی۔ اسی فکری ارتباط کا ایک نتیجہ داراشکوہ کی مجمع البحرین ۴ ہے۔ اس سے پہلے صوفیہ کے عقائد (خصوصاً مغلوں سے ماسبق عہد میں) ایرانی اثرات کے حامل تھے، انھیں بیدانتی نہیں کہا جاسکتا۔ قتیل نے چشتی سلسلے کے بارے میں یہ کہا

---

۱ معدن الفوائد/۱۱

۲ نجم الغنی: تاریخ اودھ جلد دوم

۳ ہفت تماشا (باب دوم)

۴ داراشکوہ: مجمع البحرین، مرتبہ محمد محفوظ الحق۔ طبع کلکتہ ۱۹۲۹ء

ہے کہ "رقص و وجد جو چشتیہ سلسلے میں رائج ہے۔ انھوں نے بیراگیوں سے سیکھا ہے کیونکہ وہ لوگ بھی اکثر بتوں کے سامنے رقص کرتے تھے"۔ یہاں بھی قتیل نے سطحی معلومات پر بھروسا کیا ہے۔ ایران میں تو بیراگی نہ تھے۔ وہاں رقص و سماع کا ذکر حافظ شیرازی ہی کے بیشتر اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً

ببین کہ رقص کنان می رود بنالۂ چنگ
کسے کہ اذن نمی داد استماع سماع

اسی طرح وہ بعض خرافی روایات کی تطبیق پر قیاس کرتا ہے مثلاً ایک قصہ سکھدیو اور جنک کا بیان کر کے لکھتا ہے کہ میں نے کسی کتاب میں یہی قصہ چشتیوں کے پیشوا ابراہیم ادہم سے منسوب دیکھا ہے۔ اس قسم کی روایات، کرامات، یا خرافی حکایات کسی فیصلے کا مدار نہیں ہو سکتیں یہ تو اسلام اور یہودیت وعیسائیت میں بھی مشترک ہیں [1]

غرض کہ صوفیہ کے بارے میں قتیل نے جو کچھ لکھا ہے اس میں تین باتوں کو خاص طور سے ملحوظ رکھا جائے، اولاً یہ کہ وہ صوفیا سے سوء ظن پر قیاس کرتا ہے ثانیاً اسے تصوّف کا نہ عملی تجربہ ہے نہ کتابی علم ہے، سوم یہ کہ وہ بہرحال شیعہ ہے اور شیعوں کے زمانۂ اقتدار میں تصوّف کے خلاف جو ذہن پیدا ہو گیا تھا اس کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کا معتد بہ حصہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔ اگر اعتراض کا رُخ تصوف سے ہٹا کر محض بدعتی

---

[1] ڈاکٹر رادھاکرشنن نے ہندو فلسفہ و تہذیب کے اثرات سے بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندستانی رسوم وعقائد سے مسلمانوں کے دوسرے فرقوں کی نسبت شیعہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ انھوں نے غالباً رسوم تعزیہ داری پر قیاس کیا ہے ملاحظہ ہو۔

RADHAKRISHAN: EASTERN PHILOSOPHY AND WESTERN THOUGHT (OXFORD UNIVERSITY, 1964)

صوفیوں اور تصوف کی قبیح رسوم وعقائد کی طرف ہو۔ لیکن اسے بے دلیل اور علی الاطلاق رد کرنا، سوائے مذہبی تنگ نظری کے کچھ نہیں ہوسکتا۔

اس سے قطع نظر ان مماثل حکایتوں میں جو ہندوؤں کے اوتاروں اور مسلمانوں کے صوفیوں سے منسوب کر دی گئی ہیں، ہندستانی فکر اور اسلامی تصوف ایک دوسرے سے قریب آتے ہوئے تلاش کیے جاسکتے ہیں اور ان کا گہرا مطالعہ ہمیں بعض اچھے علمی نتائج تک پہنچا سکتا ہے۔

باب چہارم میں ہندستانی تہواروں کا ذکر ہے۔ اس کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ اپنی حکومت کے زمانے میں مسلمان یہاں کے تہواروں میں عام طور سے حصہ لیتے تھے۔ نہ صرف بادشاہ اور امراء ہندستانی تہوار مناتے تھے جن کی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں مل سکتی ہیں بلکہ عوام بھی پورے جوش وخروش سے شرکت کرتے تھے، اگرچہ ان کے بعض رسوم و اعمال اسلامی عقائد کے صریحاً خلاف نظر آتے ہیں۔ مثلاً دسہرے کے دن بعض ہندو عوام میں نیل کنٹھ کے دیدار کا رواج ہے، اکثر مسلمان بھی اس میں ان کے مقلد تھے[۱]۔ اسی طرح ہولی مسلمانوں میں بھی کھیلی جاتی تھی۔ نیز دیوالی کے سلسلے میں مسلمانوں کی رسوم کا جو بیان قتیل نے کیا ہے وہ خاص طور سے توجہ کے لائق ہے۔ انگریز بہادر نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے اس اتحاد وارتباط میں رخنے پیدا کر دیے اور ہولی کا رنگ مسلمانوں پر ڈالنا خلاف قانون بنا دیا[۲]۔ تاآنکہ مسلمان رفتہ رفتہ ہندستانی تہواروں سے دست کش ہو گئے۔

لیکن اس بیان کو حجت بنا کر یہ نہ کہا جائے کہ اب ان روایات کو زندہ کرنے میں کون مانع ہے۔ کیوں کہ آج ہندستانی مسلمانوں کا موقف اس زمانے

---

[۱] ہفت تماشا (باب چہارم)

[۲] ہفت تماشا (باب چہارم)

سے قطعاً مختلف ہے ۔ اب سیاسی مصالح سامنے آتے ہیں اور صدیوں کی بنی ہوئی خلیج ایک دن میں پاٹی نہیں جا سکتی ۔ اپنی غلطی کا اعتراف اور دوسروں کی کوتاہی سے درگزر کرنے کے لیے بڑی عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کی ضرورت ہے، ان سب کے ماسوا آج ہندستان کا طبقۂ اکثریت احساس برتری میں مبتلا ہے، اور اس کا ردعمل مسلمانوں پر لازماً احساس کمتری کی شکل میں ہو رہا ہے ۔ اس لیے موجودہ حالات میں یہ بہت دشوار ہو گیا ہے کہ ایک بڑا طبقہ مخلوط تہذیب کو نظری اور عملی سطح پر برابر جھٹلاتا رہے ۔ پھر بھی اقلیت سے یک طرفہ تعاون حاصل رکھے ۔ ماضی کی ان شیریں روایات کو زندہ کرنے کے لیے دونوں فریقوں کو اپنی ذہنی سطح میں بہت کچھ فراز پیدا کرنا ہوگا ۔

ہندستانی تہواروں کے بیان یا ہندستانی شادی بیاہ کی رسموں میں عرسوں میلوں، ٹھیلوں، نذر و نیاز اور ایسی ہی دوسری معاشرتی چیزوں میں یہاں کے مسلمانوں نے ہند وطرز معاشرت کا کتنا گہرا اثر قبول کیا، اس کا بیان تاریخ کی کتابوں میں جابجا ملے گا اور اس کتاب میں یکجا بہت کچھ مل جائے گا ۔ لیکن ان باتوں کا تعلق زیادہ تر عوام سے یا متوسط طبقوں سے ہے ۔ اعلیٰ فکری سطح پر بھی ہمیں اس تہذیبی اختلاط کی شہادتیں مل سکتی ہیں خصوصاً صوفیانہ افکار کے وسیلے سے عجمی اور ہندی اثرات اسلامی فکر تک بہت آسانی سے پہنچ گئے تھے ۔ پھر بھی جس چیز نے ہندستان کے مسلمانوں کی مذہبی اور فکری انفرادیت کو برقرار رکھا، وہ دو نمایاں باتیں تھیں ۔ ایک تو اسلامی فقہ کی جامعیت اور زندگی کے تمام مسائل و معاملات کا احاطہ یعنی مسلمان ملوک اور امراء اپنے غلط اعمال کی بھی فقہی تاویل و توجیہہ تلاش کرتے تھے اور اپنے تئیں اسلامی فقہ کی گرفت سے آزاد نہیں سمجھتے تھے[1] پس یہ تو

---

[1] تاریخ کی کتابوں میں اس کی بہت دلچسپ مثالیں ملیں گی، ازاں جملہ وہ واقعہ یاد کرنا چاہیے جو ملا عبدالقادر بدایونی نے اکبر کے درباری فقہا کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اس نے (مسلسل)

ممکن تھا کہ وہ جس مسلک میں اپنے لیے عملی سہولت دیکھیں اسے اختیار کر لیں، لیکن اسلام نے جس طرح نکاح، طلاق، بیع وشریٰ اور مذہبی فرائض کی شرعی حد بندی کر دی تھی۔ اس کا لازمی تقاضا تھا کہ وہ بحث بڑھتے بڑھتے جزئی مسائل تک پہنچ جائے۔ تعبیر کی غلطی نے ہمیشہ ہر فلسفے کو مسخ کیا ہے۔ یہاں بھی یہ آزادی "حلّتِ غراب" کی بحثوں تک پہنچی۔ لیکن مجھے سر دست صرف اس مسئلے سے سروکار ہے کہ فقہی حد بندیوں نے مسلمانوں کی معاشرتی انفرادیت باقی رکھنے میں غیر معمولی رول ادا کیا ہے۔

دوسری خصوصیت مسلمانوں کی تہذیبی برتری تھی۔ وہ اپنی میراث میں عرب وعجم کی ہزاروں سال کی تاریخ اپنی پشت پر لے کر آئے تھے اور انھیں اس کی ضرورت نہیں تھی کہ نشست وبرخاست کے معمولی آداب سے لے کر مہات مسائل تک کہیں بھی وہ دست نگر رہے ہوں۔ خود ایرانیوں اور ترکوں کی تہذیبی میراث اتنی قیمتی تھی کہ نہ صرف مسلمانوں کے معاشرتی تقاضوں

(حاشیہ بقیہ ص ۱۴۱) سوال کیا بیک وقت کتنی عورتوں کو نکاح میں رکھنا جائز ہے۔ فقہاء نے تین سے اٹھارہ تک مختلف عدد بتائے۔ آخر بدایونی نے کہا کہ "متعہ امام مالک اور شیعہ علماء کے نزدیک مباح، امام شافعی اور امام اعظم کے نزدیک حرام ہے۔ جب مالکی مذہب کا قاضی اس کا حکم باضابطہ صادر کر دے تو اس وقت امام اعظم کے مذہب میں بھی بالاتفاق مباح ہو جاتا ہے۔" بادشاہ نے فرمایا کہ ہم قاضی حسین عرب الکی کو قاضی بناتے ہیں۔ اور قاضی یعقوب کو آج سے معزول کرتے ہیں۔ اسی وقت قاضی حسین کو وکیل بنایا گیا اور اس نے متعہ کے جواز کا فتویٰ دے دیا۔" بدایونی: منتخب التواریخ (اردو ترجمہ/ ۴۳۸-۴۳۹)

اگرچہ بدایونی کا یہ خیال درست نہیں ہے کہ متعہ کو امام مالک مباح سمجھتے ہیں۔ لیکن اس واقعہ کو فقہی تاویل کی مثال کے طور پر دیکھنا چاہیے۔

کی تکمیل کر سکے بلکہ دوسری اقوام کے لیے بھی نمونہ بننے کی صلاحیت رکھتی تھی۔
ہندستان کی معاشرت کا بیان پہلی بار قدرے تفصیل سے بابر نے اپنی توزک میں کیا ہے۔ اس سے یہ دیکھنا چاہیے کہ مغل شائستگی نے یہاں قدم جمائے اور شیوع حاصل کیا تو ہندستانی سوسائٹی کا کیا رنگ تھا۔ ایک تو حاکمانِ وقت کی تہذیب اور فیشن قدرتی طور پر سند اور نمونہ بن جایا کرتا ہے۔ دوسرے یہاں کی تہذیب کمتر ہونے کے ساتھ بہت ہی محدود طبقے میں سمٹی ہوئی تھی۔ اس لیے پہلی بار تہذیبی قدروں کی تعمیم مسلمانوں ہی کے دور میں ہوئی یہ تہذیب کیا تھی؟ اسے چند لفظوں میں بتانا مشکل ہے۔ اس کتاب کے سوا شرر کی کتاب "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ"، بھی نظر میں رکھیے تو زیادہ واضح تصویر ذہن میں آسکتی ہے۔
مسلمانوں کے اثر سے یہاں کے ہندو شرفاء کی خواتین نے بھی پردہ شروع کر دیا تھا اور وہ اس میں مسلمانوں سے زیادہ اہتمام کرنے لگے تھے۔ رابندرناتھ ٹیگور نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ ان کے بچپن تک بنگال کی شریف ہندو عورتیں اتنا سخت پردہ کرتی تھیں کہ انھیں گنگا اشنان کرنا ہوتا تھا تو پالکی میں سوار ہو کر جاتی تھیں جس پر چاروں طرف سے پردہ پڑا رہتا تھا، اور انھیں پالکی سمیت دریا میں غوطہ دیا جاتا تھا۔ قتیل نے بھی لکھا ہے کہ اٹھارھویں صدی میں معیارِ تہذیب و شرافت یہ تھا کہ مسلم تہذیب سے کتنی مماثلت ہے۔ "جن ہندوؤں کو مہذب مسلمانوں کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا ہو، یہ دستور ہے کہ لڑکا صبح کو بیدار ہو کر اپنے والد کو سلام کرتا ہے چاہے وہ ایک ہی کمرے میں سوئے ہوں اور ان میں تربیت یافتہ لڑکے اپنے باپ کو "آپ" سے مخاطب کرتے ہیں ۔۔ ۔۔ ۔۔ اس گروہ کے اکثر

KRISHNA KIRPALANI: RABINDRANATH TAGORE: A BIOGRAPHY (LONDON. 1962) P.18

لوگ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے نام کی ہنسلی اپنے بچوں کے گلے میں ڈالتے ہیں اور ان کی نیاز کا کھانا پکواتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگ شیعی عقیدے کی طرف مائل ہو کر اپنے بچوں کے نام کا تعزیہ مسلمانوں کے گھروں سے اٹھواتے ہیں۔ کچھ لوگ صوفیوں کے عقائد کی پیروی کر کے اپنے بھائیوں سے چھپ کر، مسلمانوں کو عرس کے لیے روپیہ دیتے ہیں، اور کسی چشتیہ، قادریہ یا سہروردیہ سلسلے کے بزرگ کا عرس کراتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ اپنی عورتوں کو پردے میں بٹھاتے ہیں اور مسلمانوں کی تقلید میں انھیں چوپالے کی سواری میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں بھیجتے ہیں۔“ ؎

اس کتاب میں قتیل نے ہندستانی فرقوں کی ان رسموں کا بیان بھی کیا ہے جو پیدائش سے موت تک انجام پاتی ہیں۔ انھیں اس نظر سے دیکھنا چاہیے کہ تہذیبی اختلاط کے اس دور میں یہ رسوم مسلمانوں کی زندگی میں کہاں تک اثر انداز ہوئیں۔ یہ مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

دنیا میں جہاں بھی اقتصادی تقسیم ناہموار رہی ہے اور عام لوگوں کو اپنی ضروریات زندگی میں دوسروں کا دست نگر رہنا پڑا ہے۔ وہاں علم بھی سمٹ کر محدود ہوا ہے، اور اس کے نتیجے میں توہم پرستی وضعیف الاعتقادی نے عوام کو زندگی کی ہفت خواں طے کرنے میں بڑی مدد دی ہے یہ ممکن نہیں کہ عقل کی روشنی میں انسان اتنا کربِ آفریں سفر طے کر سکے۔ یہ توہمات ہی ہیں جو دکھی انسانوں کو کارزارِ حیات سے نکال لے جاتے ہیں۔ ایک بڑی طاقت پر ان کا غیر متزلزل اعتقاد ہی انھیں اپنے سماج کی زورآور قوتوں کے مقابلے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ ہفت تماشا میں آپ کو ہندستانی عوام کی سچی تصویر نظر آئے گی۔ جہاں سخی سرور، شیخ سدو، شاہ مدار،

؎ ہفت تماشا (باب پنجم)

ستیلا دیوی سب اپنی اپنی نبرد آزمائی میں مصروف ہیں۔ شاہ مدار کی چھڑیاں بڑی دھوم سے منائی جاتی تھیں، دور و نزدیک سے لاکھوں انسان قافلہ در قافلہ چلتے تھے اور ہفتوں تک جشن رہتا تھا۔ "چھڑیوں" کی وجہ تسمیہ غالباً یہی تھی کہ یہ قافلے جھنڈیاں اور علم لے کر چلتے تھے جو "شاہ مدار کے جھنڈے" کہلاتے تھے۔ اور میرا خیال ہے کہ ہندستانی شعبدے بازوں کو، یا ان لوگوں کو جو بندر بھالو وغیرہ نچاتے ہیں، مداری بھی اسی لیے کہا جاتا ہے۔ شاہ مدار کے مریدوں میں اکثریت ایسے ہی جہلا کی تھی کہ وہ سال بھر تک محنت کر کے جو کچھ کماتے تھے اسے ایک ہی ہفتے میں شاہ مدار کے نام پر لٹا دیتے تھے۔ اسی لیے اردو میں کہاوت "مرنے کو ماریں شاہ مدار" آج تک چلی آتی ہے۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ میر حسن نے دہلی سے لکھنؤ کا سفر انھیں مداریوں کے قافلے کے ساتھ کیا تھا اور اس جلوس کا انھوں نے اپنی مثنوی میں ذکر کیا ہے۔ ان کی مثنوی کا تہذیبی پس منظر تفصیل سے سمجھنے کے لیے بھی اس معاشرت کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

سخی سرور یا سرور سلطان وغیرہ کے بارے میں ٹمپل نے اپنی کتاب میں تمام خرافی حکایات کو جمع کر دیا ہے، وہاں تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔[۲]

دوسری بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں ہندستانی فرقوں کے مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی، حتیٰ کہ ہندوؤں نے مذہبی عقیدے کے طور پر انھیں "راکشس" اور "شودر" سمجھا تو اس پر بھی قناعت کر لی، ایسا ہی معاملہ دوسرے رسوم و عقائد کا تھا جن میں ایک ستی کی رسم بھی ہے۔ انگریزوں نے بعد میں راجا رام موہن رائے کی تحریک پر

۱۔ میر حسن: گلزارِ ارم (مجموعۂ مثنویاتِ میر حسن۔ نولکشور ۱۹۴۵ء) ص ۱۳۶-۱۴۰۔

۲۔ اس کا اردو ترجمہ "حکایاتِ پنجاب" کے نام سے تین جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ اسے مجلس ترقی ادب لاہور نے چھاپا ہے۔

برا سے خلاف قانون قرار دیا اور بڑی کوششوں سے اس قبیح رسم کو بند کیا۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں اس کی قباحت کو اپنی مذہبی رواداری کے جذبے کی بنا پر برداشت کر رکھا تھا۔ آج جب کہ تاریخ کی الٹی تعبیر کرنے کی ہوا چل رہی ہے۔ اسے بھی مسلمانوں کے نسق کی کمزوری سمجھا جائے گا۔ قتیل نے ستی کی رسم کا جو بیان کیا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے:

"ستی کا جلوس حاکمِ وقت کے دروازے کے سامنے سے گزرتا ہے، کبھی کبھی حاکم بھی اس میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہ بات داخل آئین ہے کہ چاہے حاکم ہندو ہو یا مسلمان وہ ستی کے جلنے سے پہلے، اس کی خواہش کے مطابق روپیہ دینے کا وعدہ کرتا ہے، اگر وہ دیکھتا ہے کہ ستی روپیا لینے کے لیے راضی نہیں ہوتی تو مجبوراً وہ گھر واپس ہو جاتا ہے۔ ستی کے جلوس کے ساتھ نوبت بجانے کا حکم بادشاہوں اور امرا کی طرف سے ہے۔ جب ستی لکڑیوں کے انبار پر بیٹھ کر اپنے شوہر کے سر کو اپنے زانو پر رکھ لیتی ہے تو اس وقت بھی حاکم یا بادشاہ کی طرف سے کوئی شخص جا کر اس سے آیندہ زمانے کا حال پوچھتا ہے تاکہ بادشاہ وقت اور اس کی بیوی کے حق میں اس کی زبان سے دعائے خیر نکلے۔"

ظاہر ہے کہ ستی اگر جان بچا کر بھاگ نکلے تو اس کی بقیہ زندگی موت سے بدتر گزرتی تھی جس شے پر اس کی چھایا پڑ جاتی تھی اسے بھی ناپاک سمجھا جاتا تھا، ایسی صورت میں اگر مسلمان بادشاہ اپنے اختیاراتِ حکومت سے کام لے کر ستی کو غیر قانونی قرار دے بھی دیتے تو برادری اور سماج میں اس غیر منصفانہ سلوک پر کس طرح پابندی لگا سکتے تھے؟ اور اس زمانے کے جاہل عوام اس کی تعبیر یہی کرتے کہ مسلمان حاکم ہمارے مذہبی امور میں بے جا مداخلت کر کے ہمارے دھرم کو نشٹ کرنا چاہتے ہیں اس سے دلوں میں گرہیں پڑ جاتیں اور حکومت کرنا مشکل ہو جاتا۔

شادی کی رسمیں دوسری تمام رسموں سے زیادہ مسلمانوں میں مقبول ہوئیں

آج بھی شمالی ہندستان کے مسلمان گھرانوں میں شادی کے موقع پر یہی تماشا ہوتا ہے۔ جو قتیل نے ہفت تماشا میں لکھا ہے۔

۴

ڈاکٹر محمد عمر جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ تاریخ میں اُستاد ہیں۔ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب سے کہنگی اور گمنامی کی گرد جھاڑ کر، اسے دوبارہ نئے لباس میں جلوہ گر کیا اور معاشرتی تاریخ پر کام کرنے والوں کو اس کی اہمیت سے روشناس کرایا ہے۔ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی تھی اس وقت فارسی ہندستان کی سرکاری زبان تھی اور تصنیف و تالیف یا علمی مباحث کا ذریعۂ اظہار بھی۔ اسی لیے انشا نے اردو زبان کے قواعد کی کتاب بھی فارسی میں لکھی اور یہی سبب ہے کہ شعرائے اردو کے بیشتر تذکرے فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ اب زمانے کی روش بدل گئی ہے۔ علوم مروجہ بھی وہ نہیں رہے جو پہلے معیار علم و فضل سمجھے جاتے تھے۔ فارسی زبان کی کتابوں کے مخاطب بھی تعداد میں کم رہ گئے ہیں۔ چنانچہ عوام سے سروکار نہیں خواص بھی جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں فارسی مآخذ سے ان کی بے خبری بہت کھٹکتی ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے ہندستان کی تاریخ فارسی اور عربی سے عالمانہ واقفیت کے بغیر لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ لیکن یہ بھی اس عہد کی ستم ظریفی ہے کہ فارسی سے بالکل نابلد ہونے کے باوجود لوگ ازمنۂ وسطیٰ پر وثوق کے ساتھ گفتگو کر لیتے ہیں۔

ہفت تماشا اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے شمالی ہندستان کی معاشرت کے سلسلے میں بنیادی ماخذ ہے۔ اس سے بے نیاز ہو کر کوئی مورخ نہیں گزر سکتا لیکن میں نے زمانۂ حال میں عزیز احمد کی کتاب :

STUDIES IN ISLAMIC CULTURE IN INDIAN ENVIRONMENT:
کے سوا اور کسی کتاب کے مصادر میں ہفت تماشا کا نام نہیں دیکھا حالانکہ جتنا مواد اس میں ہے وہ اس کی کسی ہم عصر کتاب میں شاید ہی یکجا مل سکے۔

زمانہ کی ضرورت اور کتاب کی اہمیت کا لحاظ کرکے، اس کا اردو ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے۔ انگریزی اور ہندی زبانوں میں بھی اسے منتقل کر دیا گیا ہے اور وہ تراجم اس کے بعد شائع ہوں گے۔ امید ہے کہ اس کتاب کے نئے روپ سے اس کے افادے کا نطاق وسیع تر ہو جائے گا، اور اب ہند ایرانی معاشرت یا مغل شائستگی کے بہت سے پہلوؤں پر نئے انداز اور نئی تعبیروں کے ساتھ گفتگو کی جا سکے گی۔

کسی زبان کی کتاب کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے بعض بنیادی شرائط کی تکمیل ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو مصنف اور اس کے عہد کی تہذیب و روایات کے پس منظر سے واقفیت ہو، ورنہ انجام یہ ہوتا ہے کہ سرجادوناتھ سرکار جیسا عالم اور مؤرخ، اورنگ زیب کے آخری زمانے کے اس خط کو جس میں اس نے خدا سے توبہ و انابت کی ہے اور خسران دنیا و آخرت کا ذکر کیا ہے یہ کہہ کر پیش[1] کرتا ہے کہ خود شہنشاہ کا مجرم ضمیر اسے آخر عمر میں ملامت کرتا تھا اور وہ گناہوں کے بوجھ سے دبا ہوا اپنے ماضی کے افعال پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ اب سرکار کو یہ کون سمجھائے کہ اورنگ زیب کا وہ خط "مجرم ضمیر" کی کراہ نہیں ہے، بلکہ ایک نہایت متقی اور صالح مسلمان بھی، جس کی ساری زندگی کامل زہد و ورع میں گزری ہو، آخری وقت

SARKAR: SHORT HISTORY OF AURANGZIB (1930) PP304-385.
نیز ملاحظہ: شبلی: اورنگ زیب پر ایک نظر / ۹۸-۱۱۶ (علی گڑھ ۱۹۲۴ء)

میں ایسی ہی باتیں لکھے گا۔ مسلمان کا ایمان ہمیشہ خوف و رجا کے درمیان رہتا ہے۔ وہ کبھی اپنے اعمال صالحہ پر اس پندار میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ میرے لیے نجات یقینی ہے اور میں خدا کے برگزیدہ بندوں میں شامل ہو گیا ہوں۔

چونکہ ڈاکٹر محمد عمر نے اس عہد کی معاشرت پر تحقیقی کام کیا ہے جس زمانے میں سونت تماشا لکھی گئی ہے، اس لیے وہ تاویل و تعبیر کی کسی ایسی غلطی کے مرتکب نہیں ہوتے ہیں۔ انھوں نے کتاب کا ترجمہ اس دور کے سیاق و سباق کو ذہن میں رکھ کر کیا ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہو مترجم کو اس کا دعویٰ تو نہیں ہے، لیکن اصلاً قوت و مہارت کی ضرورت اس زبان پر ہوتی ہے جس میں ترجمہ کیا جائے پھر تو اگر مصنف کا مفہوم بھی گرفت میں آگیا ہے تو بعض اوقات اصل سے زیادہ بلیغ انداز میں مترجم کے قلم سے ادا ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو جناب محمد عمر نے اس ترجمے پر واقعی بہت محنت کی ہے۔ انھوں نے خواہ مخواہ لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور یہ محض مرادی بھی نہیں ہے بلکہ جہاں اسلوب و ادا میں جیسی سہولت دیکھی اسے اختیار کر لیا ہے۔

تراجم کے بارے میں ایسی رائیں علی العموم اصل سے مقابلہ کیے بغیر ظاہر کر دی جاتی ہیں۔ لیکن میں اپنی رائے ذمہ داری کے ساتھ ظاہر کر رہا ہوں اس لیے کہ میں نے پورے ترجمے کا مقابلہ اصل فارسی متن سے کیا ہے اور جہاں کہیں مناسب سمجھا ہے ترمیم بھی کی ہے۔

میر بہادر علی واثق

سید بہادر علی واثق، مصحفی کے شاگرد تھے لیکن ان کے حالات اور کلام عام طور پر دستیاب نہیں۔ مصحفی نے ریاض الفصحا میں ان کا مختصر ترجمہ اور فارسی کلام کا طویل انتخاب دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"شیخ بہادر علی واثق تخلص از سادات ترمذی، بزرگانش دراصل از خطۂ ترمذ بودہ اند۔ از مدت چہار سال در قصبۂ چھبرامئو دکذا، قنوج، مضاف صوبۂ اکبر آباد استقامت ورزیدہ اند خودش ہم دران جانشو و نما یافتہ۔ دراینا میکہ برائے تحصیل علوم در لکھنؤ قیام ورزیدہ آں روزہا بہ سبب موزونیٔ طبع چیزے موزون می کرد بذریعۂ میر ساجد علی صاحب برائے مشورۂ سخن پیش فقیر رسیدہ، چون فکر ہندی و فارسی ہر دو می کرد آخر آخر لب گفتن ریختۂ چند از نظم ہندی در گزشتہ بہ فارسی گوئی کمر ہمت محکم بربست جوان خلیق و صلاحیت شعار است عمرش ...... خواہد بود"[1]

---

[1] ریاض الفصحا/۳۶۰-۳۶۱۔

مصحفی نے ان کے اردو کلام کا انتخاب نہیں دیا۔ لیکن اردو کے صرف آٹھ شعر "تذکرۂ شعرائے فرخ آباد" مؤلفہ منشی محمد ولی اللہ میں نقل ہوئے ہیں۔[1] اس تذکرے میں ان کا حال "سید" تخلص کے ذیل میں لکھا گیا ہے۔[2] لیکن ہمارے پیش نظر دو نادر اور کمیاب مآخذ ایسے ہیں جن سے نہ صرف وامق کے حالات پوری تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں بلکہ بعض نئی اور دلچسپ باتیں بھی سامنے آتی ہیں۔ ان میں پہلا ماخذ اردین کی مشہور کتاب "تاریخ فرخ آباد" ہے۔ اور دوسرا جیراتی لعل بے جگر کا تذکرہ۔

(۱)

مسٹر اردین کسی زمانے میں فرخ آباد کے کلکٹر تھے۔ انھوں نے بنگش خاندان کی تاریخ انگریزی میں لکھی تھی جس کا ترجمہ اردو میں بھی شائع ہو چکا ہے لیکن اب نایابی کی حد تک کمیاب ہے۔ اردین نے وامق کے حالات "عنوان خاندانِ بنگش معروف" لوحِ تاریخ" سے نقل کیے ہیں۔ یہ کتاب خود بہادر علی وامق کی لکھی ہوئی ہے اور اسی کے باب پنجم میں وامق نے اپنا اور اپنے خاندان کا احوال تفصیل سے لکھا ہے۔ "لوحِ تاریخ" ۴۵۵ صفحوں کی مبسوط کتاب ہے جس کی تالیف ۱۲۵۵ھ (۴۰-۱۸۳۹ء) میں ہوئی۔ اس کا ایک نسخہ اردین کو بہادر علی کے بھتیجے سلامت علی نے مستعار دیا تھا۔

"لوحِ تاریخ" کی تالیف کا سبب بیان کرتے ہوئے وامق نے لکھا ہے کہ ۱۲۴۸ھ (۳۳-۱۸۳۲ء) میں بخشی منور خاں نے فرخ آباد اور یہاں کے نوابوں کی ایک تاریخ لکھنا شروع کی تھی اور اس کی تدوین میں ولی اللہ کی "تاریخ فرخ آباد" کے علاوہ "خلاصۂ بنگش" وغیرہ کتابوں سے بھی مدد لی۔ علاوہ ازیں بخشی منور علی خاں نے ایک کہن سال بزرگ الہ داد خاں ولد مقیم خاں چیلہ سے بعض روایتیں زبانی بھی دریافت کر کے شامل کیں۔ پھر اس کتاب کی ایک جلد

۱؎ اردو ادب جلد ۴ شمارہ ۱/ ۳۴ ۲؎ نیز ملاحظہ ہو صبحِ گلشن / ۲۱۳۔

نواب دلاور جنگ ولد نواب حسین علی خاں کو اور دوسری دھرم داس کایستھ کھرّا کو نذر کی۔ اسی میں منور علی خاں نے لکھا ہے کہ مجھے چونکہ اردو انشاپردازی میں مہارت نہیں تھی اس لیے میں نے یہ کتاب میر بہادر علی کے سپرد کر دی کہ وہ اس مسالے کو سلیقے سے ترتیب دے کر لکھ دیں۔ چنانچہ ۱۲۵۵ھ میں بہادر علی نے اسے اپنے طور پر لکھ کر واپس کیا اور جو مزید حالات انھیں معلوم تھے وہ اپنی طرف سے بڑھا دیے۔ اسی کا نام "عنوان خاندانِ بنگش" یا "لوحِ تاریخ" رکھا گیا۔ دونوں تاریخی مادّے ہیں جن سے سال تالیف ۱۲۵۵ھ مستفاد ہوتا ہے "کیا بنی ہے میاں یہ خوب کتاب" سے بھی تاریخ برآمد ہوتی ہے [1]

اسی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ بہادر علی چھبرامئو کے رہنے والے تھے۔ جو فرخ آباد سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر ایک قصبہ ہے۔ ان کے مورثِ اعلیٰ زین العابدین خاں تھے جو مدینے سے آ کر ترمذ میں بس گئے تھے۔ ان کی اولاد میں سے کچھ لوگ ہجرت کر کے ہندستان وارد ہوئے اور لاہور میں اقامت اختیار کی۔ لاہور سے یہ خانوادہ چھبرامئو (سرکار قنوج صوبہ اکبرآباد) میں آگیا تھا۔ بہادر علی کا بیان ہے کہ ان کے خاندان کو چھبرامئو میں آئے ہوئے تقریباً پانچ سو برس ہوئے ہوں گے۔ پہلے اس قصبے میں ۷۰۔۸۰ گھرانے سیدوں کے آباد تھے اور تین محلوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ صرف ایک محلے میں پانچ سات گھر رہ گئے تھے۔ اس خاندان کے بیشتر افراد عہدِ مغلیہ میں بسلسلہ روزگار دہلی میں رہتے تھے اور قاضی، مفتی، دیوان، تحصیلدار وغیرہ جیسے ممتاز عہدوں پر فائز تھے۔

بہادر علی کا بیان ہے کہ مرہٹوں کی تاخت و تاراج کے زمانے میں

---

[1] تاریخ فرخ آباد (اردو ترجمہ) / ۹-۱۰

ان کے خاندانی کاغذات اور سامان برباد ہوا۔ اسی میں شجرۂ نسب بھی گم ہوگیا اس لیے وہ اپنا شجرہ علی التواتر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ بہادر علی کے کتب خانے میں جو پرانی کتابیں محفوظ تھیں ان کی مہروں اور دستخطوں کے ذریعے صرف چھ پشتوں تک کا علم ہو سکا۔ اپنے باپ اور دادا کی روایت سے بہادر علی کا بیان ہے کہ چھپرامئو کے سادات سید کمال کی اولاد میں تھے۔ اور سید کمال لاہور سے آئے تھے۔ ان کے لڑکے سید علی امجد نے چھپرامئو کی سکونت اختیار کی تھی۔ دوسری اولاد سمدھن پرگنہ تالگرام متصل قنوج اور اور خاص تالگرام، سانڈی، مارہرہ اور سکت پور وغیرہ میں بود و باش رکھتی تھی۔ بہادر علی کا آبائی مذہب مسلک اثنا عشری تھا۔ ان میں کچھ لوگ علانیہ اور کچھ خفیہ طریقے سے اسی مسلک کے پیرو تھے۔

بہادر علی کے دادا کا نام غلام حسین تھا۔ وہ ۱۱۰۱ھ (مطابق اکتوبر ۱۶۸۹ء تا ستمبر ۱۶۹۰ء) میں پیدا ہوئے۔ یہ پہلے نجیب خاں کی سرکار میں ایک سو پچیس[۱۲۵] ماہوار کے ملازم تھے۔ پھر شجاع الدولہ کے نوکر ہوئے اور سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا۔ اسکے بعد نواب دائم خاں چیلہ نواب احمد خاں کی ملازمت کی۔ پہلے فوج دار رہے، اسّی روپیا مہینہ تنخواہ ملتی تھی۔ پھر بہ حیثیت طبیب پچاس روپیہ مہینہ پاتے تھے۔ ازاں بعد نواب کی بیوی اور بیٹیوں کو دس روپیا مہینہ پر تعلیم دیتے رہے۔ غلام حسین خاں کا قیام آخر وقت تک فرخ آباد میں دائم خاں کے مکان کے پھاٹک میں رہا۔ مرنے سے پانچ چھ سال پہلے ان کے بیٹے انھیں چھپرامئو لے آئے تھے۔ یہیں ۲۷ رمضان ۱۲۲۶ھ (مطابق ۱۸۱۲ء) کو انھوں نے عالم باقی کا سفر اختیار کیا۔

بہادر علی کا بیان ہے کہ ان کے دادا خدا رسیدہ اور صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے۔ اسی سلسلے میں یہ روایت بھی بیان کی ہے کہ ایک مریض نے دادا کو خواب میں دیکھا کہ اس سے کہہ رہے ہیں "میری قبر سے گھاس اکھیڑ

کر اور پیس کر اپنے سینے پر ضماد کرو۔" مریض نے خواب کے مطابق عمل کیا اور بالکل صحت یاب ہوگیا۔ غلام حسین نے دو فرزند اپنے پیچھے چھوڑے تھے۔ حشمت علی اور چراغ علی۔

چراغ علی کی پیدائش ۱۱۵۷ھ - ۱۷۴۴ء میں ہوئی۔ ۲۵ سال ہی کی عمر میں کسی عارضے کے باعث ان کی بینائی زائل ہوگئی۔ باقی قوی بالکل ٹھیک تھے بلکہ حس لامسہ یہاں تک بڑھی ہوئی تھی کہ روپیہ ہاتھ میں لے کر اس کا الٹا سیدھا رخ تک بتا سکتے تھے۔ حافظہ بھی بہت اچھا تھا چنانچہ چھپرامئو کے باشندوں کے انساب اور خاندانی حالات زبانی یاد تھے۔ عمارت کا نقشہ بنانے میں ماہر تھے اور حاضر جوابی میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ علم طب کی تحصیل انھوں نے اپنے والد غلام حسین سے کی تھی اور چھپرامئو میں مطب کرتے تھے۔ ۴ رمضان، ۱۲۱۷ھ (۲۸ فروری ۱۸۰۳ء) کو چراغ علی کا چراغ حیات گل ہوگیا اور چھپرامئو میں دفن ہوئے۔

ان کی شادی قصبہ بھوجپور ضلع مین پوری میں ہوئی تھی جو چھپرامئو سے مغرب کی طرف ۲۲ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ ان کی بیوی شیخ خلیل الرحمٰن خاطب ولد شیخ خیر اللہ خاں خاطب کی دوسری بیٹی تھیں۔ انھی کے بطن سے ۲۰ شوال ۱۱۹۵ھ (مطابق ۹ اکتوبر ۱۷۸۱ء) کو بہادر علی پیدا ہوئے تھے۔

۱۲۰۱ھ (۱۷۸۷ء) میں بہادر علی اپنے دادا کے ساتھ فرخ آباد چلے آئے تھے اور دائم خاں کے پھاٹک میں رہتے تھے۔ یہاں انھوں نے چھ سال تک پڑھا۔ فارسی عربی اور صرف و نحو کی معمولی نصاب کی کتابیں، ان کے علاوہ علم ہندسہ اور علم طب کی کتابیں بھی پڑھیں۔ میر مکھو اس زمانے میں ایک خوش نویس تھے ان سے خطاطی کی مشق کی تھی۔

تحصیل علم کے ساتھ ساتھ بہادر علی صوفیہ اور مشائخ کی صحبتوں سے بھی اکتساب فیض کرتے تھے اور آروین کا بیان ہے کہ انھوں نے ایسے بزرگوں کی ایک فہرست دی ہے جن کی خدمت میں وہ حاضر ہوتے تھے۔ حافظ غلام محمد

سے بہادر علی نے قرآن شریف کا ایک پارہ پڑھا تھا اور پورا قرآن ناظرہ ختم کیا تھا۔

۱۲۰۰ھ میں جب بہادر علی کی عمر بارہ سال ہوئی تو ان کے چچا حشمت علی انھیں لکھنؤ لے گئے۔ حشمت علی پندرہ سال سے لکھنؤ میں مقیم تھے اور وہاں لالہ لچھمن سنگھ اور لالہ بدھ سنگھ کے لڑکوں کے اتالیق تھے۔ یہ دونوں سارست برہمن تھے اور راجا ٹکیٹ رائے کی سرکار میں ملازم تھے۔

حشمت علی نے اپنے بھتیجے کو میر ساجد علی کے سپرد کر دیا۔ یہ حشمت علی کے بڑے گہرے دوست تھے اور معلمی ان کا بھی ذریعہ معاش تھا۔ کچھ دنوں بعد بہادر علی نے مولوی کمال الدین شاہجہاں پوری سے صرف و نحو پڑھی اور اسی زمانے میں شعرا سے رہ و رسم پیدا کرنے کی غرض سے پیر علی رسول پوری کے گھر آنے جانے لگے ابتدا میں مولوی غلام محمد فائق کے شاگرد ہوئے اور نور تخلص اختیار کیا۔ رفتہ رفتہ ذوق شاعری کی نشو و نما ہوتی رہی۔ اب انھوں نے میر ساجد علی سے درخواست کی کہ مصحفی سے ملاقات اور سلسلۂ تلمذ کی تقریب پیدا کر دیں۔ چنانچہ ساجد علی انھیں اپنے ساتھ لے کر مصحفی کے ہاں گئے اور حلقۂ تلامذہ میں داخل کرا دیا۔ پہلے انھوں نے سید پھر گردش اور آخر میں وامق تخلص اختیار کیا۔ فارسی میں ایک دیوان "جوالۂ عشق" کے عنوان سے مرتب بھی کر لیا تھا۔ اس زمانے میں پندرھویں دن مشاعرے ہوتے تھے جن میں جرأت انشا، میر تقی میر، مصحفی اور منتظر وغیرہ شریک ہوتے تھے۔ بہادر علی بھی ہر مشاعرے میں ضرور شرکت کرتے اور اپنا کلام پڑھ کر داد حاصل کرتے تھے۔ ذریعۂ معاش کے لیے بہادر علی نے بھی معلمی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ کچھ دنوں آصف الدولہ اور سعادت علی خاں کے عہد میں فوج کی نوکری بھی کی تھی۔

لکھنؤ میں یہ قیام تقریباً گیارہ برس رہا۔ (۱۲۰۰-۱۲۱۱ھ)۔ جب فرخ آباد کی ریاست ختم ہوئی اور اس پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو بہادر علی

اپنے وطن واپس آئے اور یہاں بھی تدریس کا مشغلہ جاری رہا۔ پھر نرودا کے ٹھاکر راجا جسونت سنگھ بگھیلا کی نوکری کر لی۔ یہ "ترودا" فرخ آباد کے جنوب مشرقی گوشے میں چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہاں انھیں آٹھ روپے ماہانہ ملتے تھے اور دو بیٹی علاوہ نذر کے ان کے لیے مقرر تھے۔ راجا کی سفارش سے انھیں چھپرامئو کی تھانیداری مل گئی۔ اس عہدے پر دو سال تک متمکن رہے۔ اس کے بعد راجا جسونت سنگھ ہی کی خواہش پر ان کی اور ان کے بھائی کنور پیتم سنگھ کی جانب سے مین پوری، بریلی اور فتح گڑھ کی کلکٹری، دیوانی، مال اور اپیل کی عدالتوں میں "راجا ترودا" کے وکیل کی حیثیت سے متعین ہو کر چلے گئے۔ اسی دوران میں راجا کا انتقال ہو گیا اور یہ نوکری جاتی رہی تو بہادر علی پھر اپنے وطن واپس آ گئے اور کئی برس تک راجا دلیر سنگھ کا یستھ سری واستو جھاؤنی والا کے لڑکوں کو پڑھاتے رہے۔ پھر چند سال تک رائے چندی پرشاد کایستھ سکسینہ ساکن محلہ سدھوارہ کے یہاں نوکر رہے۔

اس کے بعد دو برس تک شمس آباد کی کوٹھی میں مسٹر مارٹن تاجر نیل کے پاس پروانہ نویس کے طور پر پندرہ روپے ماہوار کے نوکر رہے۔ یہ نوکری بھی عارضی تھی۔ اب منشی ظہور علی عباسی شیخ پوری کی سفارش سے انھیں سدھپور ضلع ایٹہ کے جائنٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں بیس روپے ماہوار کی نوکری مل گئی۔ قضارا یہ محکمہ بھی توڑ دیا گیا اور بہادر علی روزگار کی تلاش میں پھر لکھنؤ آ گئے۔ یہاں دریاباد کی تھانیداری پر تعینات ہوئے جو لکھنؤ سے ۴۲ میل کے فاصلے پر مشرق کی طرف چھوٹا سا قصبہ ہے۔ یہاں سے بھی علاحدہ ہوئے تو ایک سوداگر کی محرری اور حساب نویسی پر ملازم ہو گئے۔ یہ بھی زیادہ دنوں تک نہیں چلی اور پھر گھوم پھر کر اسی معلمی کے پیشے پر آ لگے۔ لکھنؤ سے دوبارہ فرخ آباد پہنچے۔ یہاں بھی معلمی کرتے تھے ۱۸۳۹ء میں کتاب "لوح تاریخ" کی تصنیف کے وقت وہ لالہ دلسکھ رائے ولد لالہ شنکر پرشاد نبیرۂ دیوان

دیبی داس کے کھیاٹک میں سکونت رکھتے تھے اور ان کے شاگردوں کی تعداد اچھی خاصی ہو چکی تھی۔ بہادر علی کا بیان ہے کہ سینکڑوں چھوٹے بڑے آدمی میرے شاگرد ہوئے لیکن ایک نے بھی میری کوئی خدمت نہیں کی۔ بعضوں نے بڑے لمبے چوڑے وعدے کیے مگر ایفا ایک نہ کیا۔ لیکن میں ان سے نہ کوئی امید رکھتا ہوں، نہ حق جتاتا ہوں نہ کوئی شکایت ہے۔

بہادر علی کی شادی شیخ اکرام اللہ شمس آبادی ولد اسد اللہ فاروقی کی صاحبزادی سے ۷ ذی الحجہ ۱۲۲۰ھ (۱۸ فروری ۱۸۰۶ء) کو ہوئی۔ سسرال کے لوگ اچھے کھاتے پیتے تھے۔ وجہ معاش میں شاہی سے انھیں باغات اور مواضع عطا ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی سالانہ اور روزانہ آمدنی تھی۔ لیکن یہ بد نظمی کا زمانہ تھا اور اس جایداد پر تہوّر علی قبائی نے ناجائز طور سے قبضہ کر لیا تھا۔ دادرسی کے لیے بہادر علی کے خسر اور ان کے چچا صفت اللہ اور ایک دوسرے رشتہ دار خوب اللہ نامی نے بہت ہاتھ پاؤں مارے اور عدالت میں چارہ جوئی کی مگر حاکموں کی ناانصافی نے انھیں حق سے محروم رکھا۔ اس زمانے میں انگریز حاکم عدالتوں کا نظام چلا رہے تھے۔

بہادر علی کے کوئی جسمانی اولاد نہیں تھی۔ اس لیے وہ اولادِ معنوی یعنی تصنیف و تالیف کی طرف ہمیشہ متوجہ رہے۔ ان کے اوقات کا زیادہ حصہ پڑھنے میں، پڑھانے میں اور کتابیں لکھنے یا شعر کہنے میں گزرتا تھا۔ چھوٹی بڑی سب ملا کر تیرہ کتابیں انھوں نے اپنی یادگار چھوڑیں۔ خود بہادر علی کا قول تھا کہ "میں نے کتابیں اس غرض سے تصنیف کی ہیں کہ بجائے اولاد کے بعد مرگ میری یادگار رہیں۔" تیرھویں تصنیف "لوحِ تاریخ" یا "عنوانِ خاندانِ بنگش" ہے جس کا مختصر تعارف سطور بالا میں کرایا گیا اور جس سے آروین نے بہادر علی کے حالات اخذ کیے تھے۔

آروین نے یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۸۱۴ء یا ۱۸۱۹ء کے لگ بھگ واثق

نے اپنا تخلص سیّد کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بھاکا (ہندی) میں بھی شعر کہتے تھے اور اس میں "منہی" تخلص کرتے تھے۔ لیکن ان کا ہندی کلام دستیاب نہ ہو سکا۔ فارسی کلام کا انتخاب ریاض الفصحا میں موجود ہے[1]۔ اردو کی ایک غزل اور چند اشعار ولی اللہ کی تاریخ فرخ آباد میں نقل ہوئے ہیں[2]۔ اس سے زیادہ کلام دستیاب نہیں۔

بہادر علی بھی اپنے آبائی مسلک کے مطابق شیعہ تھے اور ۱۲۲۵ھ کے بعد ہر سال تعزیہ داری کی رسم بڑے اہتمام سے کرتے تھے چوں کہ اس کے لیے ان کے مکان میں کافی جگہ نہیں تھی اس لیے گھر کے پاس ہی دو بیگھہ زمین اس نیت سے خریدی تھی کہ اس میں ایک سکونتی مکان اور ایک امام باڑہ تعمیر کرائیں گے۔ چنانچہ ۱۳ محرم ۱۲۴۱ھ (۳۰ اگست ۱۸۲۵ء) کو امام باڑے کا سنگ بنیاد بھی رکھ دیا گیا لیکن اپنے افلاس کی وجہ سے اس کی تکمیل نہ کرا سکے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ان شاء اللہ یہ میری زندگی ہی میں مکمل ہو جائے گا۔

بہادر علی نے ۲۳ شعبان ۱۲۷۰ھ (مئی ۱۸۵۴ء) کو انتقال کیا اور اسی زیر تعمیر امام باڑے میں دفن کیے گئے۔ ان کے باپ بھی یہیں سپرد خاک کیے گئے تھے[3]۔

بہادر علی ایک غیور، خود دار اور حلیم مزاج انسان تھے۔ آردین نے خود ان کا قول نقل کیا ہے کہ "جس دن سے میں نے کتابوں کا لکھنا شروع کیا ہے آج تک کسی امیر آدمی کی تعریف میں کچھ نہ لکھا اور نہ کبھی ان کی عنایت کا خواستگار ہوا، جب کبھی کوئی صاحبزادوں میں سے شہر کے اس کو بلواتا تھا وہ جانے سے انکار کرتا تھا۔ اس کا قول تھا کہ دنیا میں دو باتیں ہیں، قاعدہ یا فائدہ، اور جس شخص کو دونوں میں سے کسی کی خواہش نہیں وہ کیوں بڑے آدمیوں کی خوشامد کرنے لگا"

واثق کی ایک غزل کے چھ اشعار جو "تاریخ فرخ آباد" مؤلفہ مفتی ولی اللہ

---

[1] ریاض الفصحا/ ۲۶۱-۲۶۲ [2] بحوالہ نذر ادب" ج ۲ شمارہ ۱ [3] تاریخ فرخ آباد (اردو) ...

میں نقل ہوئے ہیں یہ ہیں ؎

کس آئینہ رو کے طلب گار ہیں ہم ۔ کہ حیرت سے جوں نقشِ دیوار ہیں ہم
سبک دوش کر ہم کو اے تیغِ قاتل ۔ بہت بارِ سر سے گراں بار ہیں ہم
ذرا ٹک برس ہم پہ اے ابرِ رحمت ۔ سیہ کار ہیں ہم، گنہ گار ہیں ہم
نہیں ساغرِ مے کی کچھ ہم کو حاجت ۔ ترے لعلِ مے گوں سے سرشار ہیں ہم
کرے کیا اثر خاک ہم کو دوا کچھ ۔ تری چشمِ فتاں کے بیمار ہیں ہم
کیا ہم کو تنگ ایسا اس دل نے سید
کہ دن رات بت کے پرستار ہیں ہم

(۳)

بہادر علی وامق کی ایک تصنیف "قمر اللطائف" کا حوالہ خیراتی لعل بے جگر کے تذکرے میں ملتا ہے اور اس کے بعض اقتباسات بھی نقل ہوئے ہیں۔ تذکرۂ بے جگر کا واحد قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن کے کتب خانے میں محفوظ ہے[1]۔ جو تقریباً ۱۴ سطری سطر کے ۲۰۸ صفحوں کو محیط ہے۔ اس میں جا بجا بے دریغ حک و اضافہ اور ترمیم و تنسیخ کی گئی ہے۔ ایسے داخلی قرینے کافی موجود ہیں جو اسے مؤلف کا اصل مسودہ ثابت کرتے ہیں۔ بے جگر کا نام خیراتی لعل، قوم کایستھ بھٹناگر، وطن سکندر آباد ہے۔ وہ ۱۲۴۰ھ میں قصبہ مرادنگر (ضلع میرٹھ) کے تھانیدار تھے۔ تذکرہ زیر بحث کی تالیف کا آغاز ۱۲۳۶ھ میں (بہ اعتبار قرائن) ہوا اور اگرچہ ۱۲۳۷ھ یا ۱۲۳۸ھ کے لگ بھگ وہ اس کی تالیف سے فارغ ہو گئے۔ لیکن ۱۲۴۳ھ تک اس میں اضافے کرتے رہے تھے۔

اس تذکرے کی تالیف میں خیراتی لعل نے کئی تذکروں سے مدد لی ہے جن میں سب سے زیادہ مواد مصحفی کے تذکرۂ ہندی سے لیا گیا ہے۔ دوسرے

---

[1] شمارہ: ہندوستانی مخطوطات ۶۴ ب۔

نمبر پر خلیفہ غلام محی الدین عشق و مبتلا میرٹھی کا تذکرہ "طبقاتِ سخن" ہے جس کے اقتباسات جا بجا نقل کیے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ جن تذکروں سے استفادہ کیا ہے ان میں "قصر اللطائف" کا نام بھی آتا ہے۔ جو اقتباسات اس کے حوالے سے نقل ہوئے ہیں ان سے اور کتاب کے نام سے بھی ظاہر ہے کہ یہ کتاب شعرا کے لطیفوں پر مشتمل ہو گی۔ لیکن اب ناپید ہے اور تذکرۂ بے جگر کے سوا کسی کتاب میں اس کا حوالہ نہیں ملتا۔

"آبِ حیات" میں محمد حسین آزاد نے کربلا بھانڈ کا جو لطیفہ لکھا ہے[1] وہ قدرے اختلاف کے ساتھ بہادر علی کی کتاب "قصر اللطائف" میں بھی لکھا گیا ہے۔ بے جگر نے اسے نقل کیا ہے:

"در قصر اللطائف مؤلفہ سید بہادر علی بچپیراموی باین وجہ مندرج آبی کہ روزے نواب، آصف الدولہ مرحوم از کربلا نامی نقال کہ یکتائے این فن بودہ است فرمودند کہ امروز نقلے نو و تازہ بیار۔ اتفاقاً قلندر بخش جرأت کہ شاعر ریختہ گو و نابینا ست (کذا) ہمدران روز بحضور حاضر بود۔ کربلا گفت کہ اے پیر و مرشد! شاعران این زمانہ ہم کور آمد و شعر ایشان ہم کور۔ نواب فرمود کہ چگونہ است؟ ہاں بگو۔ کربلا این شعرش را[2]

جو سنتے تھے میاں تیرے کمر ہے
کہاں ہے کس طرف ہے اور کدھر ہے؟

بدیہہ برخواند و نابینا .... (مغشوش) تمام فرش را از دستِ خود می جُست و بار بار مصرعِ دوم را بر زبان می آورد۔ وزیر بہادر

---

[1] آبِ حیات، ص ۲۴۳ طبع دہم۔ [2] یہ شعر جرأت کا نہیں، شاہ مبارک آبرو کا ہے (نکات الشعرا، ص ۱۳۱ طبع ثانی) اور بالکل اختلاف تمام تذکروں میں ملتا ہے۔

خیلے منبسط شد و انعامش داد۔ جرأت خجلانہ از ان جا بر آمد و بہ ہمین گنہ مخمس ہجو کریلا کردہ تشہیر داد چنانچہ مطلع اوّلش است:

ملی کریلا کی گھروالی راہ جو ہم کل تھر کی بھولے[۱]

اس بند کے بقیہ مصرعے فحش ہیں اس لیے ترک کیے جاتے ہیں ٹیپ کا مصرع - اگلا جھوے بگلا جھولے ساون ماس کریلا پھولے "، آب حیات میں بھی نقل ہوا ہے۔

دوسری جگہ سودا کے ترجمہ میں ایک لطیفہ نقل کیا ہے جس کی تصدیق یا تردید کسی دوسرے ماخذ سے نہیں ہوتی۔ ان لطائف میں بعض اشعار یا الفاظ خلاف تہذیب ہیں وہ ہم نے قصداً حذف کر دیے ہیں:

"در کتاب بحر اللطائف، مؤلفہ سید بہادر علی ترمذی الاصل المتخلص بہ سید ساکن قصبہ چھپرامئو سرکار قنوج، مضاف مستقر الخلافت اکبر آباد مسطور است، "درہنگامیکہ (۴ ۹. الف) نواب آصف الدولہ بہادر مرحوم زیب فرمائے وسادہ وزارت گردیدند چون دران ایام مزاج شان از عہد صاحبزادگی بطرف ہزل نہایت راغب و مصروف بود و دران ضمن ہر کہ کلمات ہزل مزاج باوشان یا با دیگرے می نمود دکمال منبسط گردیدہ بانعام بے کرانش معززمی فرمودند لہذا نظر بہ برین معنی میرزا محمد رفیع سودا این قطعہ در تاریخ جلوس شان بر مسند وزارت، گفتہ بردند کہ مادہ تاریخ این بود (فحش) از ان جا کہ مثل مشہور است کہ سلاطین و امرا گاہے بہ سلامے برنجند و گاہے بہ دشنامے خلعت دہند۔ نواب ممدوح باصغاے این تاریخ خیلے برہم گردیدہ حکم بہ بے عزتی مرزاے موصوف فرمودند۔ چنانچہ معروف است کہ سودا بہ نہایت عبرت در روزے چند جہان فانی را پدرود

---

[۱] تذکرہ بے جگر مخطوطہ انڈیا آفس لندن / ورق ۔۴ ۔ الف

کرد و چون بہانۂ موتِ او بہ سبب خوردنِ انبہ بسیار بود لہذا شخصے در ہمان تاریخش چنین یافتہ "انبہ کھاتے کھاتے سودا کی جان نکلی" و عزیزے بہ ہمین مضمون در فارسی تاریخ برآوردہ: "آہ سودا انبہ خوردہ و مرد"۔[1]

مذکورہ دونوں مادّوں سے ۱۱۹۵ھ برآمد ہوتے ہیں اور یہی سودا کا سالِ وفات ہے جیسا کہ دوسرے شواہد سے بھی ثابت ہے۔ لیکن نواب آصف الدولہ کی برہمی اور مسند نشینی کی محض تاریخ کہنے پر بے عزتی کرنے کا جو واقعہ لکھا گیا ہے وہ محلِ نظر ہے۔ آصف الدولہ ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ میں تختِ وزارت پر متمکن ہوئے تھے۔[2] اس کے تقریباً سات سال کے بعد سودا کی وفات ہوئی ہے جس سے سودا کا "بہ ہمین غیرت در روزے چند جہان فانی را بدرود کرد" کی روایت قطعاً بے بنیاد ثابت ہوتی ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ سودا کی موت زیادہ مقدار میں آم کھا لینے کے سبب سے واقع ہوئی ہو لیکن اس کی تائید کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوتی۔

اسی "قصر اللطائف" سے ایک اور لطیفہ میر محمد حسین کلیم دہلوی کے احوال میں لکھا گیا ہے۔ تذکرۂ بے جگر کے الفاظ یہ ہیں:

"میر بہادر علی چھپراموی در کتاب مؤلفۂ خود در حاشیہ نامِ قصر اللطائف نقلی نگاشتہ کہ بہ عبارتِ خود مترجم می شود و آن اینست کہ روزی محمد حسین کلیم کہ ریختہ را بہ اعتقادِ خود بہ طرز مرزا بیدل می گفت اشعارِ بالاطبع زادِ خویش از غایتِ گرم جوشی بہ پیشِ نواب اسد یار خان بخشی نواب بہادر کو طبعِ شوخ داشت بسیار می خواند حتیٰ کہ او بے دماغ شد لاجرم بدلِ خود اندیشید کہ سخنی

---

[1] ایضاً، ورق ۹۳۔ ب۔ [2] تاریخ اودھ، نجم الغنی، ج ۳ ص ۷۔

دستخنے؟) باید گفت کہ کلیم ازیں کلام واہی ساکت گردد آخر تحریرے
کردہ (۱۵۴۔ب)، بطرف دیگران مخاطب شدند کہ یاران دی
شب خوابے دیدہ ام عجیب۔ آن ہا گفتند کہ صاحب بفرمایند گفت
کہ از یاریِ طالع سعید در عالم خواب سعادتِ قدم بوسی جناب
مرتضوی علیہ السلام کہ این نعمت غیر مترقبہ در خیال ہم میسر نبود دریافتم
فقیرے دادخواہ بر بارگاہِ عالی جاہ در حالتِ نالہ و آہ شور و غوغا
کنان رسید۔ اشارتے بمن فرمودند کہ برو و ببین۔ دیدم کہ فقیرے
بنگی (کذا)، لنگوٹ بندے، چوب کلانے بر دوش و از غایتِ جوش
و خروش استادہ۔ گفتم کہ اے بیدل باین تن و توش از دستِ
کدام ظالم ... مظلوم شدہ کہ متصل می نالی۔ گفتا کہ در حقیقت
من بے دلم و کلیم نام ریختہ گوئے بر من دستِ تطاول دراز کردہ
می نہرو تہ انہ دیوانِ من اطفال دو صد مضمون زادہ طبع مرا کہ
از شیرہ جان شیر پرورش آن ہا دادہ بودم بہ لباس نازیبائے عبارت
پوچ خود در آوردہ بنام خود مشہور می کند و این نشتر بیدردی
در جگر من بیدل می شکند۔ خدارا آن بگو کہ ازین دل آزاری ہا دست
بردارد۔ گفتم کہ بروشن او را خواہم فہمانید۔ کلیم بے چارہ خجل شد
و رفت۔"[1]

منقولہ بالا اقتباسات سے یہ ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ پوری کتاب نہایت دلچسپ ہوگی اور اپنی نوعیت کی پہلی تالیف ہے جس میں شعرا کے لطائف جمع کر دیے گئے ہیں۔ یہ اگر دستیاب ہو گئی تو بہت سی کارآمد باتیں اس کے ذریعے سے معلوم ہو سکیں گی۔ (۱۹۵۶ء)

---

[1] تذکرۂ خیراتی لعل بے جگر قلمی، ورق ۱۵۴۔الف

کرامت علی شہیدی

شاید ہی کوئی اردو کا جاننے والا ایسا ہو جس نے منشی کرامت علی شہیدی مرحوم کے مشہور و مقبول نعتیہ قصیدے کے یہ شعر نہ سنے ہوں:

مدینے کی زمیں کے گر نہ لائق ہو مرا لاشہ ۔۔۔ کسی صحرا میں واں کے طعمہ ہوں میں دام اور دَد کا
تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے ۔۔۔ قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

ان کی لاتعداد تضمینیں ہو چکی ہیں اور قبول عام کے دربار میں ممتاز جگہ مل چکی ہے۔ اسی طرح یہ شعر:

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے ۔۔۔ دن عیش کے گھڑیوں میں گزر جاتے ہیں کیسے!
عام ہیں اس کے تو الطاف شہیدی سب پر ۔۔۔ تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

ضرب المثل کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن بہت کم ہیں جو کرامت علی شہیدی کے احوال و آثار سے پوری واقفیت رکھتے ہوں۔ آج ہم اس باکمال شاعر کی زندگی اور کلام پر مختصراً کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔

شہیدی کے والد کا نام عبدالرسول خاں عروضی اور وطن اناؤ کے ضلع میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہریا پور ہے۔ عبدالرسول خاں کا پیشہ معلمی تھا اور زدہ رنجا

لہ تنہا: مراۃ الشعراء جلد ا، ۳۳۸ ۔ حافظ جلال الدین حمزی نے "نظم لطیف" ... ص ۱۶۶

کیت رائے رئیس لکھنؤ کو فارسی پڑھاتے تھے۔ فن عروض میں کامل دست گاہ رکھتے تھے اسی لیے عروضی کے لقب سے معروف ہوئے۔ شہیدی نے بھی علم عروض اور فن حساب میں بڑی مہارت بہم پہنچائی تھی۔ ممکن ہے کہ ان علوم کی تحصیل انھوں نے اپنے والد سے ہی کی ہو۔

شہیدی کی عمر کا بیشتر حصہ سیر و سیاحت میں بسر ہوا چنانچہ انتقال بھی وطن سے ہزاروں کوس دور مدینہ منورہ میں ہوا تھا۔ وہ زیادہ تر دہلی اور بالنس بریلی میں رہے۔ فن شاعری میں باقاعدہ تلمذ مصحفی سے تھا۔ ویسے محسن کا قول ہے کہ شاہ نصیر دہلوی کو بھی بعض غزلیں اصلاح کی غرض سے دکھائی تھیں[۱]۔ یہ بھی مشہور ہوگیا کہ وہ ناسخ کے شاگرد ہوئے تھے۔ محمد یحییٰ تنہا لکھتے ہیں۔

شہیدی عالم شباب میں لکھنؤ تشریف لے گئے یہ وہ زمانہ تھا کہ شیخ ناسخ کا علم شہرت بلند ہو رہا تھا۔ آپ نے شیخ صاحب سے ملاقات کرنی چاہی وہ غرور بے جا و تفاخر سے ایک نوجوان شوخ مزاج کو دھیان میں نہ لاتے، اور اپنی زیارت سے محروم رکھا۔ یہ نہایت آزردہ ہوئے۔ شیخ صاحب کے ملازم سے دیوان منگوایا اور اسی وقت ان کی مشہور غزل پر غزل کہی اور وہیں چھوڑ کر چل دیے۔ غزل مذکورہ کا مطلع یہ ہے:

مرا سینہ ہے مشرق بود و باش شیر یزداں کا
فضائے لامکاں سے قرب ہے میرے نیستاں کا

شیخ صاحب نے ہر چند تلاش کیا مگر ان کا پتہ نہ چلا صرف اتنی سی بات ہے جس پر

(حاشیہ تقیہ ص ۱۶۵) میں انھیں امروہہ ضلع مراد آباد کا باشندہ بتایا ہے یہ محض غلط ہے شہیدی کا امروہہ آنا بھی کسی ذریعہ سے ثابت نہیں۔ سید فرزند احمد صفیر بلگرامی اپنی تالیف جلوۂ خضر (جلد ۱/ ۱۵۰) میں کہتے ہیں کہ دیوان ان کا مطبع اسدی میں چھپا تھا جس میں "ساکن ہڑہ پورہ ضلع اناؤ" لکھا ہے۔

[۱] سراپا سخن / ۱۸۲ وغیرہ۔

تذکرہ نگاروں نے طرح طرح کے حاشیے چڑھائے ہیں اور شہیدی کو ناسخ کا شاگرد مشہور کرتے ہیں۔ حالاں کہ وہ ابتدا میں مصحفی کے شاگرد تھے اور بہ زمانہ آمد ورفت دہلی چند غزلوں میں شاہ نصیر دہلوی سے اصلاح لی تھی [1]۔"

شہیدی اٹھارہ برس کی عمر میں ایک انگریز کے منشی مقرر ہوئے، اور اسی کے ساتھ دہلی آئے تھے۔ محمد یحییٰ تنہا کا بیان ہے کہ سنہ ۱۸۵۰ء میں دہلی آئے تو نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے بھی ملاقات ہوئی [2]۔ شیفتہ نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ بے تکلف، وارستہ مزاج، وسیع المشرب اور آزادانہ زندگی بسر کرنے والا شخص ہے۔ سفرِ حجاز میں یہ شیفتہ کے ساتھ تھے۔ یہ سفر ۱۲۵۵ھ مطابق سنہ ۱۸۳۹ء میں ہوا ہے اور اسی سفر میں سنہ ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء کو شہیدی کا انتقال ہوا۔ اس لیے یہ قول کہ سنہ ۱۸۵۰ء میں شیفتہ سے ملاقات ہوئی غلط ثابت ہوتا ہے۔ سنہ ۱۲۵۰ھ ہو تو قابلِ قبول ہو سکتا ہے۔

ابتدا میں شہیدی بڑے زندہ دل اور یار باش الانسان تھے۔ چنانچہ اسی وارستہ مزاجی کا اثر تھا کہ ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا، اس کا لطیفہ بھی سننے کے قابل ہے۔ شہیدی نیمچ چھاؤنی میں سرکار انگریزی کے ملازم تھے اور محکمہ کمسریٹ سے ان کا تعلق تھا۔ یار دوستوں میں محکمہ کا بہت سا روپیہ صرف کر دیا، اور جب حساب کی پڑتال کا وقت آیا تو سخت پریشان ہوئے۔ چنانچہ یہ ترکیب کی کہ دفتر میں آگ لگا دی جس مکان میں دفتر تھا اس کے ایک حصے میں خود بھی رہتے تھے۔ دفتر بھی خاک سیاہ ہو گیا اور ان کا ساز و سامان بھی جل گیا پھر کچھ دن تک دیوانے بنے رہے۔ ان ترکیبوں سے جان تو بچ گئی مگر آیندہ ملازمت نہ کرنے کا عہد کیا۔ پچھلی یار باشی کی زندگی

---

[1] تنہا: مرآۃ الشعراء، جلد ۱، ص ۲۳۸ و مابعد۔ حکیم عبدالحی مرحوم نے گل رعنا (ص ۲۳۲) میں بھی شاہ نصیر سے تلمذ کا ذکر کیا ہے۔ بعض لوگوں نے منیر شکوہ آبادی کا شاگرد بھی لکھا ہے یہ محض غلط ہے۔

[2] مرآۃ الشعراء، ۲۳۸، جلد ۱۔

سے توبہ کی اور سیر و سیاحت میں وقت گزارنے لگے۔ بھوپال، اجمیر، دلی، گجرات، پنجاب کا اکثر دورہ کرتے تھے۔ دلی آتے وقت نواب شیفتہ کے مہمان ہوتے اور ان کے مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔[1]

مصحفی سے تلمذ کا رشتہ غالباً ۱۲۳۶ھ کے بعد قائم ہوا، اگر اس سے پہلے ہوتا تو ان کا حال ریاض الفصحا میں ضرور شامل کیا جاتا۔ ۱۲۴۰ھ میں مصحفی کا انتقال ہوا ہے اس لیے تعلق تلمذ زیادہ دنوں برقرار نہیں رہا۔ امکان یہ ہے کہ چند ہی غزلیں مصحفی کی نظر سے گزری ہوں گی۔ ان کی شاعری پر ویسے بھی شاہ نصیر کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ اکثر سنگلاخ زمینوں میں فکر شعر کرتے تھے۔ مضامین زیادہ دقیق اور غامض نہیں مگر خالص "لکھنوی رنگ" یا خارجیت بھی نہیں۔ نہ ان کی شاعری کو دلی کی روایات شعری کا حامل کہا جا سکتا ہے۔ دیوان مختصر ہے چھپ چکا ہے اور نایاب نہیں۔ اس کا بہت ہی مختصر انتخاب ہم اس مضمون کے آخر میں شامل بھی کر رہے ہیں۔ اسے دیکھنے سے بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ شہیدی کے ہاں فن کا احترام اور پوری پوری پابندی ہے۔ معنی بندی یا الفاظ کی بازی گری مفقود ہے مگر کلام لطف و کیف سے سراسر عاری و خالی نہیں۔ بہ حیثیت مجموعی وہ آتش کے بعد اسیر، وحید اور دوسرے معاصرین کی صف میں باعزاز بیٹھنے کے مستحق ہیں۔

شہیدی کی وفات کا واقعہ بھی بہت لائق رشک ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بھی اسی سال ۱۸۳۹ء میں حج بیت اللہ کے لیے گئے تھے۔ انھوں نے اپنے حالات سفر "ترغیب السالک الی احسن المسالک" معروف بہ "رہ آورد" میں لکھے ہیں۔ یہ سفر بڑی صعوبتوں میں ہوا ہے۔ یمن کی بندرگاہ حدیدہ سے کچھ آگے جہاز ایک زیر آب پوشیدہ چٹان سے ٹکرا کر غرق ہو گیا اور تمام مسافر کشتیوں

---

[1] ایضاً۔

کے ذریعے ایک قریب کے ویران جزیرے پر اتار دیے گیے شیفتہ یہاں سے خشکی کے راستے یمن کا علاقہ عبور کر کے حجاز پہنچے اور زیارت بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔[1]

اسی سفر حج میں شہیدی اور شیفتہ ایک ہی محمل میں بیٹھے ہوئے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف جا رہے تھے شہیدی علیل تھے انھیں اسہال کا مرض تھا ضعف سے غشی کی کیفیت طاری تھی۔ جب مدینہ منورہ کی حدود میں پہنچے اور دور سے گنبد خضرا نظر آنے لگا تو شیفتہ نے کہا "شہیدی آنکھیں کھولو، دیکھو گنبد خضرا سامنے نظر آرہا ہے"۔ شہیدی نے اسی ضعف کی حالت میں آنکھ کھول کر گنبد خضرا کی طرف دیکھا اور روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ ۴ صفر ۱۲۵۶ھ (مطابق ۷ اپریل ۱۸۴۰ء) شنبہ کا واقعہ ہے۔ اس طرح شہیدی نے اپنی پیشین گوئی پوری کر دی:

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے ۔۔۔ قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

شیفتہ کا بیان ہے کہ وہ جنت البقیع میں دفن کیے گئے:

"در مدینہ وفات یافت و در بقیع مدفون گشت"

صفیر بلگرامی نے امیر الدین آزاد بریلوی کی کہی ہوئی تاریخ وفات نقل کی ہے۔[2]

"کہو۔ جاں نثار مزار مقدس"

ان کے شاگردوں میں کوئی نام خاص طور سے قابل ذکر نہیں امیر اللہ خاں امیر رامپوری (متوفی ۱۲۹۰ھ) کے بارے میں علم ہے کہ شہیدی کے شاگرد تھے۔ نہ یہ پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے اخلاف میں کن کو چھوڑا۔ اردو کا ایک دیوان عمر بھر کی کمائی ہے۔ وہ منشی نولکشور کے پریس سے طبع ہو گیا تھا اسی میں سے مختصر انتخاب یہاں دیا جاتا ہے منشی کریم الدین مؤلف

---

[1] شیفتہ نے اس سفر کا حال ایک خط میں مومن خاں مومن کو لکھا تھا۔ یہ خط میں نے دریافت کیا تھا۔

[2] جلوۂ خضر ۲/ ۱۷۱

تذکرۂ طبقات الشعرائے ہند نے لکھا ہے کہ

"...... اٹھارہ برس کی عمر میں عہدۂ منشی گری پر مقرر ہو کر ایک انگریز کے ساتھ طرف دلی کے آیا۔ بعدازاں اس نے فقیری اختیار کی ابتدا میں ایک لڑکے مسمی گنگا پرشاد پر عاشق تھا اس واسطے بجائے یا فتاح کے ہر ایک کتاب پر (جو شہیدی کی ملک سے تھی) "یا گنگا پرشاد" لکھ دیا تھا ...... حق یہ ہے کہ طبقۂ چہارمی میں یہ شخص بھی بڑا استاد گزرا ہے اس کے نیک فکر ہونے میں کچھ شک نہیں ......"[1]

پہلے ان کے مشہور و عام قصیدے کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں:

ہوئی ہے ہمت عالی مری معراج کی طالب میسر ہو طواف اے کاش مجھ کو تیرے مرقد کا

کبھی نزدیک جا کر آستانے پر ملوں آنکھیں کبھی گرد و ربیٹھوں میں کروں نظارہ گنبد کا

فراغ دولت گر واں زندگی کا کوئی دم گزرے حسد ہو خضر و عیسیٰ کو مرے عیش مخلد کا

مدینے کی زمیں کے گر نہ لائق ہو مرا لاشہ کسی صحرا میں واں کے طعمہ ہوں میں دام اور دد کا

تمنا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

وعدۂ شام پہ کی ہم نے عبث جاگ کے صبح وہ اسی وقت نہ آتے اگر آنا ہوتا

ہو چلا خنجر بیداد کا بسمل ٹھنڈا لے ہوا اب تو کلیجا ترا قاتل ٹھنڈا

---

[1] جلوۂ خضر حصہ ۱/۱۳۱ سے کریم الدین: طبقات الشعرائے ہند/ ۳۶۹-۳۷۰ (مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء) گارسان دتاسی نے اپنے خطبات میں شہیدی کے حالات لکھتے ہوئے گلشن بے خار اور طبقات سے فائدہ اٹھایا ہے۔

اندوہِ دہی میں کٹے کس خوشی سے عمر
گر مجھ کو غم نہ ہو طرب گاہ گاہ کا

بے قراری دل کی میں کیوں کر بتاؤں یار کو
سینے پہ جب ہاتھ رکھتا ہے ٹھہر جاتا ہے دل

رحم آتا ہے مجھے اس نوجوانی پر تری
اے شہیدی رات دن کا رنج و غم اچھا نہیں

مشامِ بلبل میں رشکِ گل سے ہنوز بو بھی نہیں گئی ہے
ابھی وہ نام خدا ہے غنچہ، نسیم چھو بھی نہیں گئی ہے

شہیدی نے اپنے طرز پر یہ شعر بہت بچ کر کہا ہے لیکن اسی مضمون کو قائم چاندپوری نے ایسا نظم کر دیا ہے کہ شاید و باید:

قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری
مر چکے ہیں اسی آزار کے بیمار بہت

دل کے جانے کا شہیدی واقعہ ایسا نہیں
کچھ نہ روئے آہ اگر ہم عمر بھر رویا کیے

ناکامیِ جاوید کی ہم مانتے منت
افسوس شہیدی تری تربت نہیں ملتی

دل سے دلدار رہے جب دل نہیں کیسا دلدار
جاں سے جاناں ہے چلی جان تو جانا کیسا

ہو کے رخصت کیا خجل بیٹھا ہوں ان کی بزم میں
کاش پہلے اپنے دل سے میں اجازت مانگتا

ہزار مرتبہ دیکھا ستم جدائی کا
ہنوز حوصلہ باقی ہے آشنائی کا

(۱۹۶۰ء)

وحید الہ آبادی

مولوی وحید الدین[1] احمد خاں وحید الہ آبادی موضع کڑا پرگنہ ملیہ ضلع الہ آباد کے باوقار گھرانے میں ۱۸۲۹ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ ان کے والد مولوی امیر الدین احمد عرف مولوی امر اللہ[2] الہ آباد میں وکالت کرتے تھے اور نہایت سخی النسان تھے شعر و سخن سے بھی لگاؤ تھا۔ شاغل تخلص کرتے تھے۔ اپنے کلام پر شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی سے اصلاح لیتے تھے[3] ان کے دو فرزند تھے۔ مولوی رفیع الدین لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے اور مولوی وحید الدین دنیائے شاعری میں وحید ہوئے۔

وحید بڑے پاک باطن، صوفی منش، نیک شمائل متقی اور باکرامت بزرگ تھے۔ فارسی اور عربی کی تعلیم خاندان اور قصبے کے بزرگوں سے

---

[1] "بیاضِ سخن" مرتبہ عبد الشکور شیدا (ص ۵۳) میں ان کا نام غلام حسین لکھا گیا ہے جو غلط ہے۔ [2] بعض جگہ ان کی عرفیت "امیر اللہ" لکھی گئی ہے، لیکن تاریخ بھی سخن شعرا بھی یہی لکھتے ہیں (ص ۲۳۸) لیکن "انتخاب وحید" مرتبہ علی حسین زیبا میں مولوی ابو النصر کے حوالے سے امر اللہ ہی لکھا ہے۔ (ص ۱۴) اور یہی درست ہے۔ [3] سخن شعرا (ص ۲۳۸)

حاصل کی، شعر کہنے کا شوق ہوا تو کرڑا ایک ایک عالم اور آتش کے شاگرد
شیخ بشیر علی بشیر سے مشورہ کیا، یہ شعر ان کے استاد ہی کا ہے ۔

کہہ رہی ہے موت ہر دم، ہر زماں بالائے سر
غافلو آتا ہے وقتِ ناگہاں بالائے سر

بشیر سے فیض حاصل کرنے کا اعتراف وحید نے یوں کیا ہے ۔

اب ہم وحید واقف کس رنگ سے نہیں ہیں فیضِ بشیر سے یاں کہیے تو کیا نہیں ہے

ایک اور شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے علو تخلص کے کسی شاعر سے بھی
بھی استفادہ کیا تھا ۔

اس کے سخن کا رتبہ ہے سب سے بڑھا ہوا
جس کے کلام کو ہے یہاں کچھ علو سے فیض

مولوی عبدالغنی مرحوم گل رعنا میں فرماتے ہیں:

"........ مولوی وحید الدین کہن سال اور کہنہ مشق شاعر
تھے، مصحفی کا زمانہ انھوں نے پایا تھا اور ان سے مشورہ
سخن کیا تھا ...." (ص، ۸۴ حاشیہ)

بیاضِ سخن کے مرتب نے بھی ان کو سلسلۂ مصحفی میں شمار کیا ہے[1] اور
یہ بات عام طور سے مشہور ہو گئی ہے، لیکن مصحفی کا انتقال سنہ ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۴ء)
میں ہو چکا تھا اور وحید نے ۱۳۰۹ھ (۱۸۹۲ء) میں ۶۳ سال کی عمر پا کر
انتقال کیا اس طرح ان کی پیدائش ۱۲۴۵ھ (۱۸۲۹ء) قرار پاتی ہے اور
مصحفی ان کی پیدائش سے پانچ سال پہلے دنیا سے گزر چکے تھے لہٰذا یہ روایت
غلط ہے ۔

وحید کی سیرت اور شخصیت کے بارے میں شمس العلما نواب امداد

---

[1] ملاحظہ ہو ص ۵۳

امام اثر کا بیان نقل کرنا کافی ہوگا۔ وہ کاشف الحقائق جلد دوم ص ۳۴۳)
میں فرماتے ہیں:

"........ اس عاجز نے اپنے زمانے میں بھی ایک ایسے غزل گو شاعر کو دیکھا ہے کہ جن کی زیارت ثواب سے خالی نہ تھی یہ حضرت ہمارے مولوی وحید الہ آبادی تھے۔ شاعر کے لیے جتنی صفتیں درکار ہیں ان کی ذات بابرکات میں موجود تھیں۔ حضرت کو نہ لباس سے شوق تھا نہ کھانے سے ذوق۔ دونوں سے نہایت بے پروا اور آزاد تھے۔ جہاں نیند آئی سو رہے جہاں جی چاہا چلے گئے۔ دنیا میں کیا ہوتا ہے اس سے ان کو کوئی بحث نہ تھی۔ جن لوگوں سے احتراز مناسب سمجھا، بے ربطی رکھی کسی کی برائی میں کبھی زبان نہ کھولی۔ اگر کسی نے برا کہا تو اس کا جواب نہ دیا شکایت، غیبت، گلہ وغیرہ کی فرصت انھیں افکار شاعری سے نہ تھی۔ سالہا سال کی ملاقات میں اس عاجز نے انھیں کسی کو برا کہتے نہ سنا جس کا ذکر آ گیا اس کو اچھا ہی کہا۔ ہر طرح کے حسد سے ان کا سینہ پاک تھا حتیٰ کہ شاعرانہ حسد بھی ان کے دل میں نہ تھا۔ قناعت، بے پروائی، عجز، صبر، تحمل، صدق و صفا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے قلب اس قدر سوز و گداز سے بھرا پایا تھا کہ ان کی صحبت میں طبیعت کو بے چینی پیدا ہوتی تھی طلب جاہ سے نہایت دور تھے۔ ان کے دماغ میں اس خیال کا گزر ہی نہیں ہوا تھا کہ حکام و امراء کے حضور میں حاضر ہو کر کسی طرح کا رسوخ پیدا کیجیے۔ وہ ایسے لوگوں کے مذاق سے خبر بھی نہ رکھتے تھے کہ جو حکام وقت سے کے درباروں کی شرکت پر جان و مال وآبرو

نثار کردینے کو ہر وقت آمادہ رہتے ہیں، اور بکمال بے حیائی اور نادانی سے اس طور کی گھس پیٹھ کو سرمایۂ عزت و منزلت جانتے ہیں۔ مختصر یہ کہ مولوی صاحب مرحوم تمام ایسی صفات سے متصف تھے جو اعلیٰ درجے کے پاک سرشت، پاک طینت شاعر کے لیے درکار ہیں۔ پس لاریب انھیں صفات حمیدہ کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں سوز و گداز و خستگی کی کیفیتیں اس درجہ پائی جاتی ہیں۔ اہل انصاف کے نزدیک ان کا کلام سرمایۂ ناز و افتخار ہے۔ زبان کی عمدگی، سلاست اور روانی کے علاوہ ان کے کلام کی پُرتاثیری سے سوائے حاسد کے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ان کا کلام کہے دیتا ہے کہ ہم اس کے نتیجۂ فکر ہیں کہ جس کی خلقت میں خدا نے سادگی، راستی، سیرچشمی، حلم، تحمل، صبر، رضا، سوز و گداز درد و خستگی، آزادی، قناعت، مروت، حیا، صدق و صفا عشق، محبت، عجز، انکسار، وغیرہ وغیرہ صفتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں، ایسے صافی طینت پاک خصلت شاعر کے ساتھ اس ننگ شاعری کو کیا مقابلہ ہو سکتا ہے جو حکامِ وقت کے مناقب کے قصیدے بغل میں دابے درباروں اور حکاموں کے جلسوں میں پڑھتا پھرتا ہے اور شاعری سی عزیز شے کے ذریعے سے اپنے کو ذلیل و خوار بناتے رہتا ہے۔ ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا"

وحید کے انتقال کا حادثہ بڑا المناک ہوا۔ ہفتہ کا دن اور رمضان کی گیارھویں تاریخ تھی۔ سال ہجری ۱۳۰۹ اور عیسوی ۱۸۹۲۔ دن کے

بارہ بجے، وحیدؔ اپنے دیوان خانے میں سو رہے تھے۔ ایسی حالت میں کہ ان کا روزہ تھا۔ ناگہاں شور و شغب ہوا۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ان کے مکان سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر چودھری محمد تقی کے مکان میں آگ لگی تھی جو پھیلتے پھیلتے ان کے مکان تک آ گئی ہے۔ وحیدؔ کو معاً اپنی عمر بھر کی کمائی یعنی دیوان کا خیال آیا جو زنان خانے میں ایک کوٹھری میں رکھا ہوا تھا۔ اور اس زمانے میں اس کے شائع کرنے کی تحریک بھی ہو رہی تھی۔ بھاگم بھاگ حویلی میں گئے اور سیدھے اس کوٹھری میں پہنچے جہاں بیاض رکھی تھی۔ بس وہاں ان کے پہنچنے کی دیر تھی کہ کوٹھری بھی آگ کی زد میں آ گئی اور دھواں اتنا بڑھ گیا کہ راستہ نہ سوجھا۔ یہ ایک مونڈھا لے کر قبلہ رو بیٹھ گئے اور دیوان اپنی گود میں رکھ لیا۔ اسی وقت قلم دوات لے کر دیوان کی دفتی پر ایک وصیت نامہ لکھ دیا:

"ہر کام کا بھروسہ خدا کی ذات پر ہے۔ بعد السلام علیکم کے ظاہر ہو کہ اس دیوان پر نظر ثانی نہیں ہوئی ہے اور غلطیاں کثرت سے ہیں جو صاحب اس کے چھپوانے یا شہرت دینے کا قصد کریں لازم ہے کہ کسی اچھے شاعر کو دکھا لیں۔ اس میں کچھ مضائقہ نہ کریں۔

متاعِ نیک ہر دکاں کہ باشد

آیندؔ اختیار، مردہ بدستِ زندہ۔ وحید الدین محمد وحید عفی اللہ عنہ بقلم خود رقم نمود۔"

آگ پر قابو پانے کے بعد لوگوں نے ان کی تلاش کی تو دیکھا کہ کوٹھری میں ان کا بے جان جسم مونڈھے پر بیٹھا ہے۔ دیوان گود میں دھرا ہے۔ آگ نے ان پر مطلقاً اثر نہیں کیا۔ بس دھوئیں سے گھٹ کر دم نکل گیا۔

سید شاہ محمد علیم اللہ علیم الہ آبادی نے تاریخ وفات کا قطعہ لکھا تھا:

قصۂ غم ناک می گویم شنو — تاب اواز سوزِ حسرت گر بود
آن وحیدِ نکتہ سنجِ بے عدیل — کز غمِ او حالِ دل ابتر بود
ناگہان درخانہ اش آتش گرفت — کاندر او صد شعلہ یک اخگر بود
از پئے دیوان درجائے چو رفت — کآورد گرمیِ داور بود
بود چون فرطِ دخال از آتشش — سوزِ او کاندر جگر نشتر بود
زود تر از احتقانِ دم بمرد — رفتنی را پائے او دیگر بود
یازدہ بُد صوم از ماہ صیام — زین قیاسِ حالتِ مضطر بود
چون ز فرطِ تشنگی مشتاقِ آب — صائم تشنہ دہن اکثر بود
تشنہ کامی گفت تاریخش علیم — جائے پاکش برلبِ کوثر بود

۱۳۰۹ھ

وحید کا جتنا اردو کلام دستیاب ہوا وہ ۹۲۸ غزلیں ہیں جن میں کم و بیش ۳۲۳۲۶۲ اشعار ہیں۔ ان کے اسی کلام کا انتخاب مرتبہ سید علی حسنین زیبا انجمن ترقیٔ اردو (ہند) کی طرف سے ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تھا جس کے ساتھ ہی مرتب کا لکھا ہوا مقدمہ بھی تھا۔ اسی مقدمے سے اخذ کر کے ہم ایک واقعہ لکھتے ہیں جو وحید کے بھانجے محمد ابو نصر کے نوشتہ مضمون سے مرتبِ "انتخابِ وحید" نے درج کیا ہے:

"ایک مرتبہ آپ (وحید) کو لکھنؤ تشریف لے جانے کا اتفاق ہوا۔ لکھنؤ میں ایک بیگم صاحبہ کے یہاں مشاعرہ ہونے والا تھا۔ چوں کہ آپ کو واپسی کی عجلت تھی۔ اس واسطے شرکت مشاعرہ ناممکن تھی۔ آپ کے ایک دوست آپ کو بیگم صاحبہ کے دولت خانے پر لے گئے اور بیگم صاحبہ سے عرض کیا کہ یہ شاعر جو میرے ہمراہ ہیں دیہات کے رہنے والے ہیں چوں کہ واپس جانے والے ہیں شرکت مشاعرے میں نہیں کر سکتے۔ ان کا کلام سن لیا جائے

بیگم صاحبہ نے فرمایا مجکو کلام سننے کی فرصت نہیں ہے۔
ان کو مصرع طرح دیا جائے کہ ضم کریں میں ان کے کلام کا
اندازہ کر لوں گی مصرع طرح سنا یا گیا۔ وہ یہ تھا:

دور سے آئے ہیں مشتاقِ تماشا ہو کر

آپ نے برجستہ مصرع ضم کیا:

دور سے آئے ہیں مشتاق تماشا ہو کر
ہم سے پروانہ کرو شاہد رعنا ہو کر

مصرع سننا تھا کہ بیگم صاحبہ نے بے محابا پردہ الٹ دیا، اور
کلام سننے کی مشتاق ہوئیں۔ کلام سن کر بے حد مسرور ہوئیں۔
لکھنؤ میں بھی آپ کی شہرت ہوئی‘‘۔

ہمارے نامور طنز نگار، شاعر اکبر الہ آبادی مرحوم وحید ہی کے شاگرد تھے۔
سید شاہ محمد سجاد ابو العلائی داناپوری متوفی ۱۲۹۸ھ کے فرزند حضرت اکبر
داناپوری اور سید عزیز الدین افسر جو اکبر الہ آبادی کے ہم سبق و ہم مشق تھے،
نیز محمد شیر خاں شیر اور دلو کی نند لعل نثر وغیرہ وحید کے ذی استعداد تلامذہ
میں تھے جن سے سلسلہ چلا۔ ان کے سوا بھی الہ آباد، لکھنؤ، پٹنہ عظیم آباد اور نواح
میں آپ کے بہت سے شاگرد تھے۔ وحید کا قیام زیادہ تر کڑا یا الہ آباد
میں رہتا تھا۔ لکھنؤ اور عظیم آباد میں بھی کچھ دنوں رہے حیدر آباد دکن
کا سفر بھی کیا تھا۔

وحید الہ آبادی، مولوی غلام امام شہید، منشی غلام غوث بے خبر، میر
مینائی اور نواب مرزا خاں داغ یہ سب ہم عصر اور ہم طرح شاعر تھے اور
وحید کا مرتبہ اپنے زمانے میں کسی سے کم نہیں تھا۔

جہاں تک وحید کے کلام پر تبصرہ و تنقید کا تعلق ہے، ہمیں اس کے
غائر مطالعے کے بعد یہ کہنے میں کوئی پس و پیش نہیں ہے کہ وحید کا کلام

لہ یادگار ضیغم ص ۲۰۹

آتش و مصحفی کے رنگ میں کسی طرح کم آرز نہیں ہے لیکن بقول محمد حسین آزاد "قبول عام اور شے ہے"، اس کو کیا کیجیے کہ وحید کے کلام نے شہرت نہ پائی ورنہ یقیناً اس کے مستحق تھے کہ اپنے معاصرین امیر و داغ اور شہید و بے خبر کی طرح قدر دانی و قبولیت کے ان تمغا سے سرفراز کیے جاتے۔

وحید کی شاعری مصحفی کے رنگ میں درد و اثر سے خالی نہیں اور ان کی اندرونی کیفیات و احساسات کا آئینہ ہے مصحفی کے طرز کی یہ خصوصیت کہ اس میں ایک داخلی فضا خارجی ہوتی ہے اور لہجے کی متانت کہیں بھی غیر متوازن نہیں ہوتی وحید کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ وحید پر تصوف کا بھی غلبہ ہے۔ وہ ایک درد مند دل رکھتے تھے اور صاحب حال بزرگ تھے۔ جیسا کہ امداد امام اثر کی مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری بھی سوز و گداز اور راز و نیاز کی لذتوں سے بھرپور ہے۔ ان کی شاعری میں جگہ جگہ حقیقت کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔ زندگی اور اس کے اندرونی مسائل پر غور و فکر بھی ہے، مشاہدۂ باطن بھی۔ کائنات کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش بھی ہے اور ماسوا کی تجلیوں میں ڈوب جانے کی خواہش بھی۔ وحید کے یہاں بھاری بھرکم ترکیبیں اور دور از کار استعارے الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتے ہیں اور ٹھیک بھی ہے کہ دلی کیفیات کا اظہار سادگی کے سوا دوسرے سہاروں سے ہو بھی نہیں سکتا۔

وحید دہلی کی نسبت لکھنؤ سے قریب تر تھے، ان کے زمانے میں لکھنؤ کا رنگ شاعری جما ہوا تھا، وہ خود لکھنؤ آتے جاتے رہتے تھے اور اگر بیگم صاحبہ والا منقولہ واقعہ درست مان لیا جائے تو وہاں کی ادبی محفلوں میں شرکت بھی کرتے رہے ہوں گے۔ لیکن یہ مصحفی اسکول کا فیضان ہے کہ ان اسباب و قرائن کے ہوتے ہوئے بھی ان کی شاعری لکھنؤ کے روایتی تکلف اور تصنع سے بری ہے اور خارجی حسن سے زیادہ داخلی سوز و ساز کا مرقع ہے۔ اس میں

نری سادگی بھی نہیں کہ " دنداں تو جلہ درد ہا شند " کا اس پر اطلاق ہوتے اور یہ لفظی
رعایتیں بھی نہیں ہیں کہ " بیر یوں میں بھی مرا نازک بدن ملتا نہیں " !

ذیل کا مختصر انتخاب وحید کی شاعری کے محاسن کی ایک حد تک نمائندگی
کرے گا اور اس کی قدر و قیمت متعین کرنے میں مدد دے گا۔

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو
آج پھر شہر کے کوچے نظر آتے ہیں اداس
کس طرف لے گئی وحشت ترے دیوانے کو

نہ تھے جب اس قدر بے خود تو کیا کچھ کہتے سنتے تھے
اب اشک آنکھوں میں بھر لانا نہ کچھ کہنا نہ کچھ سننا
کچھ کہہ کے اس نے پھر مجھے دیوانہ کر دیا
اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا

یاد آ گئیں جو دشتِ مصیبت کی منزلیں
کوسوں خیال میں دلِ شیدا نکل گیا

نظر آتا ہے ویرانہ سا اب صحنِ چمن جس کا
یہیں صحبت تھی رندوں کی یہیں تھا دورِ ساغر کا

مرنے پر بھی نہیں بھولا مجھے دنیا کا خیال
کچھ اثر اب بھی ہے اے خوابِ پریشاں تیرا

چراغ بھی ہوں تو وہ ہوں کہ بے فروغی سے
ہوا کے چلنے سے پہلے ہی بجھ گیا ہوں میں

اک دن اسی کے دم سے جنوں کی تھیں شورشیں
پہلو میں اب نشاں بھی دلِ زار کا نہیں

اس مے کدے میں کتنے سبو پاکے مست ہیں
کتنے فقط شراب کی بو پا کے مست ہیں
شعر بالا کے ساتھ فارسی کا شعر بھی یاد کرلیجیے ؎
جان زنظارۂ خرابِ نازاو زاندازہ بیش
ما بہ بوئے مست و ساقی پُردہد پیمانہ را

جب زخم تھا تو اس سے بھی تھا رُخ کو شرر
اب چاک دل پہ اپنے رفو پائے مست ہیں

عجیب ظرف کے وہ لوگ ہیں زمانے میں
جو حوصلے سے محبت زیادہ کرتے ہیں

رنجِ غربت کی کون دے گا داد
اس فسانے کو آپ ہی سے کہوں

پھر کہاں ہم کہاں یہ کوچۂ یار
در و دیوار دیکھ لینے دو

اب اتنا جامے سے باہر نہ غم نکل کے چلو
نگاہیں سب کی اسی سمت ہیں سنبھل کے چلو

کیسا محشر کہاں کی پرسش
ساقی، یہی انجمن ہمیشہ

جس کی اک اک گھڑی میں تھے سو لطفِ زندگی
اس شب کی یہ سحر کوئی دیکھے تو کیا کہے

نہ کہنے پائے تا احوال رسم و راہِ الفت کا
اسے دیوانہ کر دیں گے جسے ہشیار دیکھیں گے

غربت کی شام دیکھ کے رونا سا آگیا
آنکھوں کے آگے پھر گئی صبحِ وطن ابھی

عشق کا نام لیا ہے تو ہو بہتر انجام
اب تو بدنام نہ ہونے میں بھی رسوائی ہے

جنبش پہ ہر قدم کی الٹتا تھا میرا دل
جس دم وہ آنے والے تھے آہٹ عجیب تھی

ہزاروں بار خزاں آئے باغ میں تو کیا
مری نظر میں ہیں کیفیتیں بہاروں کی

سر دھنے، روئے یا جلے، پگھلے
شمع مہماں ہے ایک ہی شب کی

آگے کیا دور تھے کیا رند تھے کیا جلسے تھے
کیا کہیں اگلی وہ باتیں گئیں میخانے سے
دل پہ گزری ہوئی باتوں کا ہے کچھ اور اثر
اب نہ بہلے گی طبیعت کسی افسانے سے

آخر میں ایک ناگوار حقیقت کا انکشاف بھی ضروری ہے۔ وحید کے بعض اشعار پر سرقے کا بھی گمان ہو سکتا ہے۔ مثلاً حالی کا شعر ہے ؎

ان کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت نہ در کی صورت

اور وحید نے کہا ہے ؎

اب مرے اشکوں سے ہے اور ہی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

خواجہ آتش کا شعر ہے ؎

فرش گل بستر تھا اپنا خاک پر سوتے ہیں اب
خشت زیر سر نہیں یا تکیہ تھا زانوے دوست

اور وحید نے کہا ہے ؎

کل بستر گل پر بھی نہ آتی تھی جنھیں نیند
وہ خاک پر اب سوتے ہیں عبرت کی ہے یہ بات

یا ؎ کل تک جو فرش گل پہ بھی رکھتے نہ تھے قدم
آج ان کی خاک تک نہیں عبرت کی بات ہے

سید انشا کا شعر ہے ؎

رکھتے ہیں کہیں پاؤں تو پڑتے ہیں کہیں اور
ساقی تو ذرا تھام تو لے ہاتھ ہمارا

وحید نے کہا ہے ؂
گھبرا کے چلے ہیں جو سوئے کوچۂ جاناں
رکھتے ہیں کہیں پاؤں تو پڑتے ہیں کہیں آج

میر کہتا ہے ؂
دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤ گے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کر

وحید فرماتے ہیں ؂
ویراں ہوا یہ دل تو پھر آباد ہو چکا
ایسا بنا ہوا نہ گھر اے آسماں بگاڑ

میر کہتا ہے ؂
یوں کہتے تھے یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

وحید نے کہا ہے ؂
چاہا تھا کچھ احوال کہیں دیکھ کے ان کو
بے خود ہوئے کچھ ایسے کہ مطلق نہ رہا ہوش

خیر اس مضمون کو تو متقدمین و متاخرین میں سے تقریباً ہر شاعر نے باندھا ہے۔

درد کے بھائی میر اثر کا شعر ہے ؂
یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثر کی ہمیں تو آس نہیں

وحید نے اسی مضمون کو نظم کیا ہے ؂

یوں خدا آپ کے بیمار کو اچھا کر دے
حال ہے نوعِ دگر ہم تو یہی کہتے ہیں

میرؔ نے کہا ہے ؎

تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

وحیدؔ کہتے ہیں ؎

دیر و حرم میں ڈھونڈھتے پھرتے ہیں کس کو ہم
جس کی طلب ہے وہ تو دلِ زار ہی میں ہے

اس مضمون کو دردؔ نے بھی متعدد جگہ باندھا ہے
اس کے سوا بھی وحیدؔ کے کلام سے بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

لیکن اس توارد سے کسی شاعر کی واقعی عظمت و رفعت متاثر نہیں ہوتی۔ ایسی لغزشیں میرؔ، سوداؔ، دردؔ، مصحفیؔ اور مومنؔ و غالبؔ سے بھی ہوتی ہیں۔

ان سب خامیوں اور لغزشوں کے ہوتے ہوئے بھی وحیدؔ کا کلام اپنے رنگ میں، درد و اثر میں، سادگی و دلنشینی میں وحید ہے اور اس کا جائز مستحق ہے کہ حق شناسی و قدر دانی کی نظروں سے پڑھا جائے۔ (۱۹۵۹ء)

اِشاریۂ اَعلام

(دو ہندسوں کے درمیان لکیر اس کی علامت ہے کہ یہ نام درمیانی صفحات پر بھی آیا ہے)

ا۔ اشخاص

(الف)

۲- مقامات

۳- کتابیں

ISBN:978-81-7587-833-4



Price: ₹99/-